مطالعۂ قرآن کا نیا منہاج

ڈاکٹر محمد عارف خان

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی حقیقی معنوں میں فلسفی تھے۔ ان کا علمی کمال یہ تھا کہ انہوں نے بڑے حکماء کی طرح قرآنی فکر کو منطق وفلسفہ کی زبان اور اصطلاحوں میں بیان کیا اور عصر حاضر کے استدلالی اسلوب کا جواب فراہم کیا۔ علمی لحاظ سے انسانوں کے ہمیشہ درجے رہے ہیں اور کم از کم ایک درجہ برہان سے تصدیق حاصل کرنا ہے۔ معروف حکیم وفلسفی ابن رشد نے استدلالی اور انسانی درجہ بندی دونوں باتوں کو بیان کیا ہے۔ ابن رُشد لکھتا ہے:

> ''انسانی آلات (منطق، عقل، فلسفہ اور برہان) بالذات اور بالطبع نفع بخش ہیں۔ اگر کوئی ان کے استعمال میں غلطی کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ منطق، عقل، فلسفہ اور برہان غلط ہیں بلکہ انہیں استعمال میں لانے والے میں کہیں نقص ہوگا۔'' (ابن رشد)

انسانی جبلت وطبعیت کے لحاظ سے انسان موجودات اور اعتبار موجودات کی تصدیق مختلف

انداز سے کرتے ہیں۔لکھا ہے:

- بعض لوگ برہان سے تصدیق حاصل کرتے ہیں۔
- بعض لوگ جدلی اقوال سے تصدیق حاصل کرتے ہیں۔
- بعض لوگ خطابی اقوال سے تصدیق حاصل کرتے ہیں۔(ابن رشد)

اگر یہ کہا جائے کہ عصر جدید استدلالی و برہانی دور ہے تو بے جانہ ہوگا۔ تاریخ میں انسانی اگاہی وشعور اور تصدیق وعمل کے بھی تین ادوار ہیں:۔

- پتھر کا دور، جہاں اِنسانی ذہن ابتدائی درجے پر تھا۔
- وسطی دور، یہ صحیفہ جات اور روایات کا دور ہے۔
- دور جدید، یہ تجربی ومشاہداتی اور استدلالی و برہانی دور ہے۔

جب کہ جدید مغربی منطق کے نزدیک علت میں تحقیق کا تسلسل تین مدارج سے وابستہ ہے:

(۱) عوامی منزل populer stage

(۲) علمی منزل Scientilfic Stage

(۳) فکری منزل Speculation Stage

یونانی ،مسلم اور عصر حاضر کے فلسفیوں اور منطق دانوں کی ایک ارتقائی تاریخ ہے اور تینوں ادوار کے نمائیدگاں کی گراں قدر خدمات ہیں۔ یونانی حکیم ارسطو کو اس علم کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ منطق کے لیے الفاظ بھی ضروری ہیں۔ الفاظ جو طاقت وتوانائی کے ساتھ ایک مفہوم رکھتے ہوں۔ براہ راست اور سیدھے انداز سے اپنی معنویت کو اجاگر کریں اور جامعیت اُن کا وصف ہو۔ ذومعنی ومبہم الفاظ کی منطق کے علم میں گنجائش نہیں ہے۔ اس کے ساتھ گرائمر یا صرف ونحو کے معیار پر پورے اترنے والے الفاظ ہی منطق کے علم کا حصہ متصور ہوسکتے ہیں۔مختصراً منطق ان اصولوں اور قوانین کا علم ہے جن کی مطابقت ومتابعت کے بغیر فکر انسانی صحیح نہیں ہوسکتی۔ منطق دراصل فکر

کے ڈھانچہ اور صورت کی صحیح تدوین کرتی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے منطق کی اقسام کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ منطق کی دو معروف اقسام ہیں۔ منطق استقرائیہ (Inductive logic) اور منطق استخراجیہ (Deductive logic)۔ منطق استقرائیہ وہ طریقہ استدلال ہے جس میں جُزوی حقائق سے کُلیہ قضیہ اخذ کیا جاتا ہے۔ الگ الگ واقعات ومثالوں یعنی جزیات سے ایک مسلّمہ کُلیہ اخذ کرنا ہوتا ہے۔ مقدمات اور نتائج کی مادی صحت کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ منطق استقرائیہ کائنات اور مظاہر فطرت کے مطالعہ سے بھی قوانین کلیہ اخذ کرتی ہے۔ خاص سے عام یا جزیات سے کلیات کا استدلال ہے۔

دوسری طرف منطق استخراجیہ مقدمات ونتائج کی مادی صحت سے بحث نہیں کرتی۔ اس کا بنیادی قانون یہ ہے کہ جو حکم پوری جماعت سے متعلق صحیح ہے وہ حکم اس جماعت کے سب افراد کے لیے بھی حق ہوگا جیسے تمام انسان فانی ہیں عام سے خاص یا کلیات سے جزیات کا استدلال ہے۔

منطق میں استعمال ہونے والے الفاظ واصطلاحیں جو اردو میں مستعمل ہوئی ہیں کا ایک مثالی خاکہ بیان کرنا مقصد ہے۔ ڈاکٹر برہاں احمد فاروقی نے ان الفاظ واصطلاحوں کو اپنے قرآنی واستدلالی پس منظر میں بیان کیا ہے اور اس میدان تحقیق وفکر کی علمی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

منطق گویا الفاظ واصطلاحوں کے استعمال سے علم کو ایک باقاعدہ تنظیم دیتی ہے اور علم کا ایک معیار مقرر کرتی ہے۔ زیر نظر سطور میں چند الفاظ اورا صطلاحوں کو اردو میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے ان الفاظ واصطلاحوں کو قرآنی فکر کی استدلالی تنظیم دی اور یوں بڑے حکماء کی طرح ''وقت'' کے مسائل کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کی دعوت دی ہے۔ منطق کے الفاظ واصطلاحوں کی ایک فہرست درج ذیل ہے:

منطق کی تعریف: منطق وہ علم ہے جس کا موضوع فکر اور اُس کے قوانین وقاعدے

ہیں۔موضوع علم منطق میں موضوع مبتداء ہے جو خبر کے مقابل ہو۔

علم: علم سے مراد ایک واقفیت وجان کاری ہے جو عالم موجودات رنگ وبو کے کسی حصہ یا نوع کے متعلق حاصل ہوتی ہے۔

فکر: علم منطق وہ علم ہے جو ہمیں فکر سے متعلق مربوط، مسلسل مکمل اور منظم واقفیت بہم پہنچاتا ہے اور فکر سے مراد شعور کی کیفیات جو استدلال کے لیے لازمی ہوں، شامل ہوتی ہیں۔

قوانین: قوانین منطق میں قانون کی تعریف یہ ہے کہ قوانین جو تغیر پذیر تو نہیں مگر قابل شکست ضرور ہیں۔

استدلال: دو یا دو سے زائد تصدیقات کے تقابل کے نتیجہ کو استدلال کہتے ہیں۔ استدلال صحیح ہونا چاہیے۔ ہمہ گیر اور تمام انسانوں پر محیط ہونا چاہیے۔

موجودات: کائنات اور اُس میں پیدا شدہ ہر شئے موجودات کے زمرے میں آتی ہے۔

مربوط: بندھا گیا۔ہم آہنگ

مکمل: ہر لحاظ سے معیاری۔

منظم: انتظام کے ساتھ ہو۔

تغیر پذیر: تبدیل ہونے کی صلاحیت ہو۔

معیاری: معیار،معیاری علم منطق معیاری علم ہے۔مگر یہ واحد معیاری نہیں ہے۔منطق کا معیار یہ ہے کہ ہمہ گیر قوانین فکر کو جانچ پڑتال سے اخذ کرے۔ انہیں مربوط، مسلسل مکمل اور منظم شکل دے۔ انسانی خیالات، اقوال اور افعال کی قدر وقیمت کا اندازہ کرے۔ خیالات کی صحت وعدم صحت ،افعال کی اچھائی وبرائی اور محسوسات کے حسن وقبیح سے متعلق فیصلہ کرنا معیاری علوم کا ہی کام ہے۔

محسوسات: تجربات ومشاہدات سے حاصل ہونے والے علم کو محسوسات کا علم کہتے ہیں اور جو چیز محسوس ہو سکے، اُسے محسوسات کہتے ہیں۔

شعور: انسانی ذہن یا نفس کی تمام وہ حالتیں جو حالت بیداری میں پیش آتی ہیں، شعور کہلاتی ہیں۔ ادراک وفکر، وجدان وجذبہ اور عمل وفعل سب شعور کی حالتیں ہیں۔

ادراک: ادراک ایک واقفیتی عمل ہے جو ہر انسان کسی شئے کو جاننے وپہنچان کے لیے کرتا ہے۔

مدرکہ: عمل ادراک کے نتیجہ کو مدرکہ کہتے ہیں۔

تصور: کسی ایک نوع کے مختلف افراد کے مدرکات کے تقابل کا نتیجہ تصور کہلاتا ہے۔

استنتاج: دو یا دو سے زیادہ تصدیقات کے تقابل کے نتائج کو استنتاج (استدلال) کہتے ہیں۔

تصدیق: دو یا دو سے زیادہ تصورات کے تقابل کے نتائج کو تصدیق کہتے ہیں۔ کانٹ نے تصدیقات کو چار ضروری اصولوں پر تقسیم کیا ہے۔ الف۔ کیت، ب۔ کیفیت، ج۔ نسبت، د۔ جہت۔

علم النفس: ایک فطری وطبعی علم ہے جبکہ منطق معیاری علم ہے۔

طبعی/فطری: قدرت وفطرت کے مختلف مظاہر سے متعلق علم کو فطری یا طبعی کہتے ہیں۔ مظاہر قدرت کا بیان، اُن کا مشاہدہ وتجربہ سے حاصل شدہ واقفیت: پھر اُن کی تحلیل اور ترکیب شامل ہے۔

حالت آگہی: ادراک وسوچ بچار کا نام ہے۔

احساس: رنج وراحت کا وجدان احساس کہلاتا ہے۔

فعلی: کام کرنے کی حالت وصورت کو فعلی کہتے ہیں۔(۱)

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ایک فلسفی تھے۔ انہوں نے منطق کے اصول اپنا کر

ایک منظم فکر دی۔ یہ فکر قرآن مجید سے ماخوذ ہے البتہ وہ علم جدید کو نظر انداز کرتے نظر نہیں آتے بلکہ تطبیق کا داعیہ پاتے ہیں اور اس ضمن میں انہوں نے گراں قدر کام کیا ہے۔ زیر نظر سطور میں علمی اصطلاحوں کے استعمال کو مثالوں سے واضح کیا جائے گا جن کو انہوں نے استعمال کر کے قرآنی فکر کو ایک نئی جہت دی۔ عصر حاضر میں کسی فلسفی دانشور کا یہ گراں مایہ کام ہے۔

قبل ازیں فلسفہ ومنطق کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ اور اصطلاحوں کی الگ سے وضاحت کی گئی ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی فکر واضح ہے مگر الفاظ اور اصطلاحیں مشکل ہیں۔ اُن کی تحریر وفکر کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے الفاظ واصطلاحات کا الگ الگ سے بیان ہے۔

منہاج:

منہاج القرآن کی فکری اصطلاح ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے فلسفہ وفکر کی بنیادی واساسی اصطلاح ہے۔ وہ مطالعہ قرآن کے لیے نئے منہاج کے متلاشی ہیں جو مقصود قرآن حاصل کر سکے۔ ایسی اقدار وجود میں آسکیں جہاں مقصود قرآن کے حصول کے لیے شرع کا نفاذ ممکن ہو سکے۔ منہاج کے دو اجزاء ہیں:

ا۔ بنیادی اصول، کہ محمد ﷺ کی ''اصلاح انسانیت'' کی آرزو مقدم ہے اور نزول قرآن موخر ہے۔

ب۔ مسائل حل کرنے کا طریقہ، یعنی منہاج، جس کے چار مدارج بیان کیے ہیں۔ یہ مدارج فلسفیانہ اور منطقیانہ اصطلاحیں ہیں جنہیں انہوں نے خوبصورتی سے استعمال کیا:

ا۔ تمیز (Distinction)

علم بالوحی (Biology) اور انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے درمیاں فرق

واتمیازات کو پیش نظر رکھنا(۲) اسی اصطلاح کو دوسری جگہ مذہبی واردات اورخرق عادت واقعات کے درمیاں تمیز کے لیے استعمال کیا ہے۔ (۳)علم اورعمل کی تمیز کوبھی موضوع بحث بنایا ہے۔اسی اصطلاح کو''اسلام وفلسفہ'' میں تمیز/امتیاز یہ ہے کہ جس فضیلت کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔اُس کے اور دوسرے مسائل کے درمیان امتیازات کیا ہیں؟ مثلاً ادراک وعلم اورعلم وجدان وغیرہ(۴)

۲۔تعین (Determination)

قرآنی علوم کی ماہیت کو واضح کرنا ہے۔ جبکہ اسی اصطلاح کو دوسری جگہ انسان اور خدا کے درمیان عبودیت کی نسبت کا تعین بیان ہے۔علم کی معرفت سے ماہیت موضوع طے کی جائے۔ اس کا جواب قضیہ مرکبہ وہبیہ کا نام ہے۔(۵)

۳۔تضمن (Implication)

مسئلہ کے حل کرنے کے عمل میں تضمن اُن شرائط ومضمرات کے تجزیہ پر مشتمل ہے۔(۶) جن پر کامیابی کا انحصار ہے۔ اسے منطق میں دلالت وصفی سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی شرائط یہ ہیں کہ ایک طرف ناظر ہو اور دوسری طرف منظور ہو یعنی عالم ومعلوم کی حیثیت کرے۔(۷)

تضمن یادلالت وصفی کو''منہاج القرآن'' (۸) میں بصیرت ،تقلید اور اقدام وخطا کو سیکھنے کے طریقے بیان کیا ہے جب کہ''قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل'' میں کسی فضیلت کے واقعہ بننے اور اُس کی صحت کے انحصار کا دار ومدار چار باتوں کے تحت مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔

(۱) ہستی باری تعالیٰ کا اقرار

(۲) سالک میں نسبت کے بلاواسطہ ادراک کی طلب

(۳) سالک میں وہ استعداد جس سے اس نسبت کا ادراک ہو سکے جسے صوفیاء وجدان (Intution) کہتے ہیں۔

(۴) اس نسبت کا وجدان کے ذریعے قابل ادراک ہونا ہے۔(۹)

حدود:

علم بالوحی کی صحت کے حدود کو واضح کرنا جن سے تجاوز کی صورت میں علم بالوحی بھی بے اثر ہو جائے گا۔(۱۰) دوسری جگہ لکھا کہ مذہبی واردات کی صحت کی حدود یہ ہیں کہ کوئی صاحب کشف والہام کسی کے لیے حجت نہیں ہے کیونکہ احتمال خطا ممکن ہے اور نبی کا کشف الہام بے خطا ہوتے ہیں۔(۱۱)

ان چاروں اصطلاحوں کے استعمال کو مزید یوں بیان کیا:۔

اگر علم بالوحی کی ماہیت وہی ہے جو ''تعین'' کے تحت بیان ہوئی ہے تو علم بالوحی کے مسائل کا حل، جنہیں انسانی علم کے مسائل سے ممیز کر کے ''تمیز'' کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ نصوص قرآنی میں کسی تعبیر، کسی تاویل اور کسی تفسیر کے بغیر میسر آنا چاہیے۔(۱۲)

ان چار اصطلاحوں کے بیان میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اُن کی اپنی قوت وطاقت بھی مسلمہ ہے اور انہیں علم بالوحی کے تناظر میں بیان کر کے ایک نیا ضابطہ دیا ہے۔ الفاظ جو استعمال ہوئے:

(۱) اصلاح انسانیت (۲) علم بالوحی (۳) انسانی استعداد کا زائیدہ علم (۴) (۱۳) مذہبی واردات (۵) علم وعمل (۶) ماہیت (۷) عبودیت (۸) شرائط ومضمرات (۹) بصیرت (۱۰) تقلید (۱۱) اقدام و خطا (۱۲) فضیلت (۱۳) سالک (۱۴) ادراک (۱۵) نسبت (۱۶) وجدان (۱۷) صحت (۱۸) کشف وایام (۱۹) احتمال خطا۔ (۱۴)

فلسفہ کی اصطلاحوں کو اپنی علمی فکر اور قرآنی مقصود میں ڈھال کر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے افکار و خیالات میں نئی جوت جگائی ہے۔ اپنے اپنے وقت میں حکماء اسلام نے

یہی کام کیا۔عصر حاضر کے علمی تناظر میں یہ کام بھی گراں مایہ ہے ۔فلسفہ مدرسہ جات میں پڑھایا جاتا ہے۔مگر رویہ معاندانہ اور مخالفانہ ہے ۔حمایت تو درکنار ہمدردانہ رویہ بھی نہیں ہے ۔اس بنا پر گذشتہ چند صدیوں سے اسلامی مواد جولکھا گیا ہے، وہ استدلالی نہیں ہے ۔ عقلیت اور حسیت کے استدلالی دور میں محض روایت سے نتائج ہمارے حق میں نہیں آرہے ۔روایت غلط بے شک نہ ہو،اُس کی کسوٹی بہرحال نتائج ہیں ۔عقلیت وحسیت نے صرف علم استدلالی ہی نہیں دیا بلکہ نتائج بھی دیئے ہیں ۔روایت ،عقلیت اور حسیت کو یکجا کرنے اور تطبیق دینے کی سعی جاری ہے ۔ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی یہ ایک نئے انداز میں کوشش ہے جو وزن رکھتی ہے ۔فلسفہ کی تاریخ کو چند الفاظ واصطلاحوں میں بیان کر کے اختصار کا اعجاز پیدا کیا:

فلسفہ دور قدیم ـــــ عقلیت ـــــ افلاطون ـــــ اثبات

فلسفہ دور وسطی ـــــ حسیت ـــــ افلاطونی عنیت ـــــ نفی وتشکیک

فلسفہ دور جدید ـــــ تنقید ـــــ تطبیق

یہ فلسفہ کے ارتقاء کی جامع الفاظ میں تاریخیت ، ماہیت اور نتائجیت کا بیان ہے۔ فلسفہ منظم علم کا نام ہے۔اس لحاظ سے یہ تینوں ادوار علمیات کے نظریئے ہیں ۔ علمیات کی جستجو کا داعیہ یہ تھا کہ حقیقت کی ماہیت اولیٰ کیا ہے ؟ اور یہ کہ اس کائنات میں انسان کا مقام ونصب العین کیا ہے ؟ان تمام سوالات کا جواب عقلیت ،حسیت وتنقید کے ذریعے دینے کی کوشش کی گئی۔تنقیدی دور سے مراد فلسفہ کا جدید دور ہے جس نے حسیت سے تشکیک پیدا ہونے کے عمل کو زیادہ یقینی علم کی طرف آنے کی سعی کی ہے اور سوال کا رُخ منظور یعنی کائنات کے بجائے ناظر کی طرف ہو جاتاہے۔ پہلے فلسفہ کا سوال تھا کہ کائنات کیاہے؟ اور اب سوال یہ ہے کہ میں کیا ہوں؟ اب علم کی شرائط تبدیل ہوگئی ہیں۔وہ شرائط یہ ہیں:

ا۔ ناظر ہو ۲۔ منظور ہو ۳۔ ناظر میں منظور کو سمجھنے کی استعداد ہو ۴۔ منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعداد کے مطابق سمجھ میں آسکے۔

وحی ان حقائق کے علم کا ایک ذریعہ ہے جو انسان اپنی استعداد سے ایک طرح حاصل نہیں کرسکتا۔ علم اور یقین دو الگ چیزیں ہیں علم کے دو مدارج ہیں:

ا۔ انسان اپنے ذرائع علم سے اشیاء کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔

ب۔ علم ایک قضیہ ہے جو حواس کے جمع کیے ہوئے خام مواد کو عقلی تصورات کے تحت منظم کرنے سے تشکیل پاتا ہے۔ اس کی بنیاد انسانی عقل ہوتی ہے۔

یوں یقین کے بھی دو مدارج ہیں:

ا۔ یقین کے پیچھے انسان کی عقل اور اس کا ارادہ اور جذبہ تینوں چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ اس لیے یقین علم سے زیادہ مستحکم ہے۔

ب۔ ایک علم وہ ہے جو یقین کی بنیاد پر جدوجہد کرنے سے خلوص کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ علم پہلی سطح کے علم سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔

''میں کیا ہوں'' یعنی مسئلے کی ابتداء منظور کے بجائے ناظر سے کی گئی تو طبعیات کے ہاں جو فلسفہ مدون ہوا۔ اس کے بنیادی تصورات یہ پیدا ہوئے۔ اسے انسان و کائنات کا مادی فلسفہ قرار دیا گیا:

(۱) مادہ بطور بنیادی جوہر کے (۲) خواص (۳) مقدار (۴) علت (۵) معلول (۶) حرکت (۷) قوت (۸) زماں (۹) مکان (۱۰) عدد (۱۱) وحدت

حیاتیات کی بنیاد پر مدون ہونے والے فلسفہ کے بنیادی سوالات یہ تھے۔

(۱) انجذاب (Assimilation) جزو سے کل اور کل سے جزو کی پیدائش (۲) انفرادیت (۳) ازخود حرکت (۴) مقصدیت

نفسیات کی بنیاد پر جو نظریہ پیدا ہوا اُس کے بنیادی تصورات یہ ہیں:۔

(۱) نفس (۲) شعور (۳) جذبہ (۴) ارادہ (۵) ادارک (۶) مقصد (۷) ذریعہ

اخلاقیات کی بنیاد پر مدون والے فلسفہ کا تصور خیر وشر ہے۔

مختلف علوم کے مدون ہونے اور فلسفہ کی صورت اختیار کرنے کی صورت میں کیا وحی کا علم کارآمد نہیں رہتا۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف یہ ہے کہ علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان امتیاز برقرار رکھا جائے تاکہ وحی ماضی، حال و مستقبل کے حوالوں سے انسانوں کے علوم مدون ہونے میں اپنا کردار برقرار رکھ سکے۔ دوسری جگہ لکھا:

''علم بالوحی کا مسئلہ یہ ہے کہ انفرادی زندگی کا نصب العین کیسے حاصل ہوگا۔ مثالی معاشرہ کیسے وجود میں آئے گا اور دین حق کا غلبہ کیسے میسر آئے گا۔''(۱۵)

اور لکھا کہ وحی اس ارادہ الٰہی کی مظہر ہے جو انسانی ذرائع علم کی تائید اور اس کے نقص کی تلافی کرتا ہے۔(۱۶)

اثبات، نفی اور تطبیق کی مثال انہوں نے مسلم معاشرے سے دی ہے، علماء متکلمین، صوفیاء اور فلاسفر مسلم معاشرے کی نمائیدہ علمی ہستیاں رہی ہیں۔ تاریخ کے ایک خاص دور میں معتزلہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ جیسے گروہوں نے جنم لیا۔ معتزلہ نے علم الکلام میں اثبات کو نمایاں کیا۔ اشاعرہ نے راسخ العقیدہ کی بنا پر معتزلہ کی نفی کی جبکہ ماتریدیہ نے دونوں کی مبالغہ آرائی کو نظر انداز کر کے تطبیق دینے کی سعی کی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے مثالی معاشرہ اور موجودہ معاشروں کے درمیان اور پھر اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی معاشرے کے درمیان تفریق کو اجاگر کر کے اقدامات کی نشاندہی کی ہے تاکہ خوف وغم سے پاک مثالی معاشرہ روپذیر ہوسکے۔ اس ضمن میں اولین طور پر انہوں نے چند اصولی موضوعات پر بحث کی ہے تاکہ اُن تصورات کے علمی وفکری پس منظر سے عملی واطلاقی صورت اجاگر ہوسکے۔ وہ فکر کو جتنی اہمیت دیتے ہیں اُس سے زیادہ عمل اور نتائج پر زور دیتے ہیں اور قرار دیتے ہیں کہ قرآن کا عمل پر اصرار زیادہ ہے۔ اُنہوں نے چند سوالات اٹھائے ہیں جو علم پر مبنی ہیں۔

ا۔ معاشرہ جو موجود ہے چاہے وہ مغربی معاشرہ ہے یا مسلم معاشرہ، ایک فکر پر استوار ہے اور فکر علم سے اخذ ہوتی ہے اور اطلاق کی صورت کے بعد اُس کی مثبت یا منفی نوعیت سامنے آتی ہے۔ وہ فکر کیا ہے؟ اُس کی بنیاد وحی کے علم پر ہے یا انسان کے زائدہ علم پر مشتمل ہے۔ وحی سے اخذ فکر اور انسانی ذہن کے زائدہ علم کی فکر میں فرق اور تطبیق کی کیا صورت بنتی ہے؟

ب۔ معاشرہ کیا ہے؟ معاشرہ کیسے وجود میں آتا ہے۔ معاشرہ زوال پذیر کیسے ہوتا ہے؟ اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی معاشرے میں فرق کی اساسی نوعیت کیا ہے؟ دینی اور لادینی معاشرہ کیا ہے؟ اور انہیں دینی کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

ج۔ موجودہ مسلم معاشروں کا بے لاگ تجزیہ کی ضرورت ہے۔ مسلم معاشرے قرآنی یا دینی معاشرے نہیں دینی کیسے ہوں گے وہ نقشہ کیا ہوگا۔ لادینی معاشروں کی ترقی کے اسباب کیا ہیں؟

د۔ زندگی کیا ہے اور اس کے کون سے پہلو ہیں اور ان کی اصلاح کا مرکزی نکتہ کیا ہے۔ علم بالوحی اور علم بالانسان کے امتیازات کی ضرورت کیوں ہے؟

س۔ موثرات زندگی کیا ہیں؟ معاشرے کی تشکیل وترقی وتنزلی میں کیا کردار ادا کرتے ہیں؟ موثرات زندگی کے قرآنی اور انسانی فکر میں فرق وکشمکش کی صورت کیا ہے؟

ح۔ اسلامی معاشرے کے لیے کیسی جدوجہد درکار ہے؟ موجودہ معاشرے کی اصلاح وتہذیب کیسے ممکن ہے؟ وہ مثالی خاکہ جس پر جدوجہد ہو اور اسلامی معاشرے کا نصب العین حاصل ہو۔

یہ وہ سوالات ہیں جو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی فکر سے جنم لیتے ہیں۔ انہوں نے ان سوالوں کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی۔ وہ جوابات کیا ہیں؟ بالترتیب بیان کیے جائیں گے۔

ل

''علم کی نسبت، یہ سمجھنا کہ وہ کسی خاص قوم یا تہذیب کا ورثہ ہے، صحیح نہیں۔ علم کی نشوونما کی سعی پوری نوع انسانی کی ذمہ داری ہے جسے صاحبان بصیرت ہی پورا کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دور تحقیق میں تمام قدیم علوم کو صرف یہی نہیں کہ زندہ کیا بلکہ انہیں دوسری اقوام کو بھی منتقل کیا لیکن جب بین الاقوامی سطح پر مسلمان ناتواں ہوگے اور ان کا فکر متحرک نہیں رہا۔ اپنا فکر مدوں کرنے کی جو جدوجہد مغربی دنیا کے دور جدید میں کی گئی وہ بھی اتنی ہی اہم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''(۱۷)

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی مذکورہ بالا عبارت اُن کی پہلے سوال کا جواب ہے جس کی وضاحت نکات کی صورت میں یوں ہے:

(۱) علم کی نسبت ایک اصول کو اجاگر کر کے علم پر اجارہ داری کے تصور کو مسترد کیا ہے۔ یہ کسی خاص قوم یا تہذیب یا اُس کے کسی سنہری دور کا ورثہ نہیں ہے۔ کسی قوم وتہذیب کا ورثہ نہیں تو یہ باور کرانا مقصد ہے کہ مسلم معاشرہ غلط زعم میں پھنسا ہوا ہے کہ محض وہی صاحبان علم ہیں۔ وحی ذریعہ علم اور بے خطا ہے اس پر یقین مسلمانوں کے لیے لازم ہے۔ یقین کے بعد اس سے نتائج پیدا کرنا بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

(۲) علم کی نشوونما انسان کے ہاتھوں میں ہے اور انسان وہ جو صاحب بصیرت ہوں۔ یہاں محض کسی خاص قوم وتہذیب کے لیے علم کی نشوونما میں نفی کی گئی ہے۔ علم کی نشوونما علم بالوحی سے بھی ہوتی ہے اور انسانی ذہن کے اخذ شدہ علم سے بھی ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ علم بالوحی بے خطا ہے اور انسانی ذہن کا زائیدہ علم اقدام و خطا سے نشوونما پاتا ہے۔

(۳) علم سرحدوں ورکاوٹوں کا پابند نہیں ہے۔ مسلمانوں کا ایک درخشاں دور تحقیق ہے جس میں علم کی نشوونما میں علم بالوحی اور علم بالانسان کی تطبیق کا گہرا عمل دخل ہے۔ مسلمانوں

نے یونانی علم کو پوری دیانت داری سے سنبھالا دیا اور محفوظ بنایا۔ بلاشک وشبہ یہ مسلمانوں کا عظیم تحقیقی کارنامہ ہے۔ مسلمانوں نے یونانی علوم کی قدر کی اور علم بالوحی کے ذریعے اُس کی راستگی کی۔ یہی علم جب دوسری قوموں خصوصاً مغربی اقوام تک پہنچا تو انہوں نے علم بالوحی کے اثرات کو الگ کر کے معدوم کرنے کی کوشش کی اور علم کو براہ راست یونان سے جوڑا اور اپنا رشتہ علمی بھی یونان سے جوڑا۔ برحال مسلمانوں نے اپنا فرض نبھایا۔

(۴) ایسا کیوں ہوا کہ مسلمانوں کا فکر متحرک نہ رہا۔ اُس کی خصوصی وجہ مسلمانوں کا بین الاقوامی سطح پر نصب العین سے عاری ہونا اور سیاسی میدان میں شکست تھی۔ زندگی رُکتی نہیں۔ رواں رہتی ہے۔ اس روانی کے لیے فکر لازمی شرط ہے۔ مسلمانوں کا فکر غیر متحرک ہوا تو اُس کی جگہ زندگی نے دوسرا فکر لے لیا جس میں حرکت تھی۔

(۵) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مغرب نے تازہ فکر مدون کرنے میں جو جدوجہد کی ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ یہی جدوجہد اُسی قدر اہمیت کی حامل ہے جیسے مسلم عہد میں فکر مدون کرنے کی جدوجہد کی گئی ہے۔ اس بات سے تطبیق کی فکر نمایاں ہوتی ہے۔ تطبیق کی صورت کو انہوں نے بیان کیا ہے اور قرار دیا ہے کہ مسلمانوں کو مغربی فکر وفلسفہ کو سمجھنا کیوں ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> ''(یہ دیکھنا) مغربی فکری عروج کی انتہاء جس درجے تک ہوتی ہے۔ اس میں فکر وفلسفہ کے تقاضوں سے پورا ہونے کے لحاظ سے کیا کمی رہ گئی ہے اور ہم مسلمان اُس میں کیا اضافہ کر سکتے ہیں اور کن بنیادوں پر کن مسائل کو سوچنے سے ہمارا مقام عالمی تہذیب میں پیدا ہوسکتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہمیں اپنی فکری نشوونما کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اور جدید مغربی تہذیب کا جائزہ لینا اُتنا ہی ضروری ہے۔''(۱۸)

ب:۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی فرماتے ہیں:۔

> ''معاشرہ ایسے مجموعہ کا نام ہے جس میں متحدہ مقصود کی خاطر یکسانیت کردار کی

بنا پر عمرانی وحدت کا شعور پایا جائے کہ ہم سب ایک ہیں۔ اگر افراد کو معاشرہ بنانا مقصود ہو تو متحدہ مقصود اور کردار میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے کوئی ہدایت طریقہ کار کی صورت میں نمایاں کرنی پڑے گی۔''(۱۹)

معاشرتی تشکیل میں متحدہ مقصود اہم شرط ہے اور معاہدہ عمرانی کے تاریخی تصور کا بھی یہی مقصد قرار پایا ہے۔ ہمارے سامنے زندہ معاشروں کی صورت یوں ہے:

۱۔ محدود وفاداریوں پر مشتمل معاشروں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان معاشروں میں محدود وفاداریوں کی بنا وطن پرستی، جغرافیائی حدود، نسلی یا لسانی وحدت پر استوار ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر تمام معاشرے عمرانی وحدت کے محدود تصور پر رواں دواں ہیں۔

۲۔ مسلم ممالک کی تعداد خاطر خواہ موجود ہے۔ تمام مسلم ممالک کا دعویٰ ہے کہ وہ محدود وفاداری کے تصور پر یقین نہیں رکھتے بلکہ اسلام کے عالمگیر تصور وشعور وحدت پر یقین رکھتے ہیں۔ البتہ تضاد کا کمال یہ ہے کہ تمام مسلم ممالک مغرب کی طرز پر جغرافیائی یا وطن پرستی یا نسلی جیسے سعودی عرب، سعودی نسل کے نام پر اور بنگلہ دیش لسانی بنیاد پر موجود ہیں، قائم ہیں، یہ وہ تضاد ہے جو ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

۳۔ مستقبل کے لیے جدوجہد کا حاصل معاشرہ کئی حوالوں سے زیر بحث ہے۔ البتہ قرآن مجید کا موقف جامع ہے اور انسان کی آرزوؤں کو باقی رکھنے کا یقین افروز صحیفہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا:

''انسانی زندگی کی تین سطحیں ہیں۔ انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی اور قرآن مجید زندگی کی ہر سطح پر ایک ایسے مقصد کے حوالے سے راہنمائی دیتا ہے جس کے حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیابی کے ساتھ ساز گار ہونے کے اصول پر یہ کائنات پیدا کی گئی ہے اور وہ مقصود انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے''۔ (۲۰)

معاشرت کی تشکیل کے تین بنیادی عوامل ڈاکٹر صاحب نے بیان کیے ہیں:۔

ا۔ انسانی شخصیت کی نشوونما

ب۔ ہیت عمرانی کی تکمیل

ج۔ ماحول کی تسخیر (۲۱)

انسانی شخصیت کی نشوونما کے چھ پہلو ہیں جو معاہدہ عمرانی کے تحت ریاستی ذمہ داری ہے۔ ان میں حیاتیاتی پہلو، عمرانی حیاتی پہلو۔ عمرانی ثقافتی۔نفسیاتی پہلو، انفسی پہلو اور ماورائی پہلو شامل ہیں۔

اس سے مراد معاشرتی اداروں کا قیام وانصرام جیسے خاندان، مسجد وغیرہ بلکہ ریاست بھی اہم معاشرتی اداراہ ہے۔

فطری ماحول اور انسانی ماحول دو اقسام ہیں۔ ماحول کو مسخر کیے بغیر معاشرت اور ادارہ جات کا قیام ممکن نہیں ہے۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل جدید کے لیے نصب العین کا تعین شرط ہے۔ معاشرے کی عمومی تشکیل کے بنیادی عناصر وعوامل کا اوپر تذکرہ کسی فکر کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ بنیادی فکر ونصب العین دراصل اسلامی معاشرے کے خدوخال ظاہر کرتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے: اسلامی معاشرہ میں عمرانی وحدت کے شعور کی بنیاد نوع انسانی کی وحدت کا تصور ہے۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی ذہن کے افراد پر مشتمل ہوں اور معاشرے میں استحکام کی بنیاد محمد ﷺ کی غیر مشروط وفاداری پر استوار ہو۔

(ج) موجودہ مسلم معاشروں کی صورت حال یہ ہے:

> ''دین کامل چند مابعد الطبعی عقائد، چند اسباق، چند معاشرتی اصولوں، چند تمدنی ضوابط چند عدالتی قوانین اور چند رسوم وظواہر میں سمٹ کر رہ گیا جو زندگی کو بدلنے میں موثر اس لیے نہ تھے کہ مستعمراتی نظام نے ہمارے معاشرے ،ہمارے اخلاق، ہماری معیشت، ہماری سیاست اور ہماری تعلیم کو لادینی

بنیادوں پر استوار کر دیا تھا۔ اس لیے عقیدے اور عبادت کا کوئی اثر معاشرت اخلاق، معیشت، سیاست اور تعلیم پر باقی نہ رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عقیدہ، وہم باطل بن گیا تھا اور عبادات رسوم وظواہر میں تبدیل ہوگئی تھیں اور زندگی عملاً لادینی نظام کے تابع ہوگئی تھی اس لیے اس کے سوائے کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ مذہب انفرادی، نجی، ذاتی، باطنی، اور شخصی زندگی کا جز وہو کر رہ جائے۔'' (۲۲)

مسلم معاشرہ کی بنیادیں علم بالوحی سے اٹھائی گئی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں مذہبی فکر کو فیصلہ کن حیثیت حاصل رہی ہے۔اس کے مقابل مغربی معاشرہ بھی مذہبی قیادت وسیادت کا روا دار تھا۔ یہاں تک دونوں معاشروں کی اساسی نوعیت مذہبی تھی۔مغرب رومی تہذیب کے زوال کے بعد تجدیدی فکر کا متلاشی تھا۔ اس دوران مسلمانوں نے مذہب کو اساس بنا کر ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی اورعروج دیا۔ اس عروج کی مدت کوئی سات سوسال پر محیط ہے۔ اس کے بعد مسلم تہذیب کے عروج کا وقت ڈھلنا شروع ہوگیا۔ مغرب نے مسلمانوں کا عروج دیکھا۔ اپنا زوال دیکھا اور پھر مسلمانوں کا زوال دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مذہبی سیادت مذہب کی روح کو مسخ کر کے محض اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے مذہب کی من مانی تعبیر وتشریح کرتی ہے۔ یہی زوال کا سبب ہے۔ یہ انقلاب انگیز نکات چودھویں وپندرھویں صدی عیسوی کے مغربی معاشرے کی تھکا دینے والی خانہ جنگی نے پیدا کیے۔اس خانہ جنگی سے اہل مغرب نے مذہبی سیادت کی کمزوری کو بھانپا اور انہیں بے اثر کر کے نئے افکار کی بنیاد رکھ دی۔ نئے افکار کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے البتہ نئے افکار نے انسان کی ترقی کے حیران کن راستے کھول دیئے۔مغرب بہت آگے چلا گیا اور مسلم دنیانے اپنے مذہبی افکار کی غلط تعبیر کو ہی مذہب سمجھے رکھا اور ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف یہ ہے کہ جب مسلم معاشرہ لادینی نمونے پر ڈھل گیا ہے تو اسے دوبارہ اسلامی نمونے پر کیونکر ڈھالا جاسکتا ہے؟ اُنہوں نے لادینی

ودینی معاشرت کے فرق کو خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے۔ معاشرہ افراد کے ایسے مجموعہ کا نام ہے جن کے درمیاں عمرانی وحدت کا یہ شعور پایا جاتا ہے کہ وہ ایک ہیں ۔ برصغیر پاک وہند میں اقتدار کے چھن جانے تک یہ تصور وحدت فقہ حنفی کی بنیاد پر قائم تھا۔ نوآبادیاتی غلبہ کے نتیجہ میں قانون کی پشت پر قوت محرکہ یعنی سیاسی حکومت نہ رہی تو زوال ہوگیا۔ یوں عمرانی وحدت کے شعور کی بنیاد جغرافیائی اور وطن پرستی ٹھہری اور معاشرہ لادینی نمونے پر ڈھل گیا۔ یہی صورت سارے عالم اسلام میں پیدا ہوئی اور تاحال تبدیلی کے آثار نہیں ہیں۔قوت مقتدرہ کی باگ ڈور سارے عالم میں مغرب کے ہاتھوں میں ہے۔ دنیا کی بدترین قسم کی جابرانہ حکومتیں، آمریت اور فوجی حکومتیں مسلم ممالک میں قائم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مسلم معاشروں کی یہ روش لادینی طرز کی ہے۔ ''قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل'' میں قرآن کو حجیت قرار دیتے ہیں جو تمام انسانی مسائل حل کرنے کے لیے کفائت کرتا ہے مگر علماء کرام نے مغرب کے انداز تاویل مذہب کی طرح قرآن سے براہ راست ہدایت اخذ کرنے پر پابندی لگا رکھی ہے اور پابند کر رکھا ہے کہ علماء کی تعبیر وتشریح ہی قابل اطاعت ہے اور یہ وہ تعبیر وتشریح ہے جو نتائج نہیں دے رہی۔ لکھتے ہیں:

> ''قرآن مجید سے براہ راست ہدایت اخذ کرنا علماء کے نزدیک خطرناک بات ہے:(ڈاکٹر صاحب کے نزدیک) علمائے کرام کچھ تو خوف زدہ ہیں اور کچھ لاشعوری طور پر مطالعہ قرآن کی اجازت عام کو اپنے وقار کے منافی خیال کرتے ہیں۔'' (۲۳)

د۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی فرماتے ہیں۔

> ''زندگی بالفعل سے اور بالقوہ کچھ چیز ہے۔ بالفعل کوئی چیز ہونے کے اعتبار سے اس کی ہستی ہے اور بالقوہ کچھ چیز ہونے کی حیثیت سے یہ مستقبل میں کچھ بن جانے کے امکان کے ساتھ تبدیل ہورہی ہے۔ زندگی اپنی بالفعل حیثیت میں جبلی داعیات، طبعی خواہشات اورنفسانی تقاضوں پر مشتمل ہے۔۔۔ زندگی

بالقوہ حیثیت سے فجور وتقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنے نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے۔" (۲۴)

زندگی ہستی ہے۔

زندگی حرکت پذیر ہے۔

زندگی اسیر جبلت ہے۔

زندگی ایک شعور ہے۔

زندگی ہستی کی جبلتی قوتوں کی بناپر حرکت (۲۵) پذیر ہوکر خودشناس اور خودشعور ہوجاتی ہے۔ اور بالفعل سے بالقوہ مقاصد کی طرف بڑھتی ہے۔

اہل علم کے نزدیک زندگی کے ظہور وارتقاء کے متعلق تین نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں:

(الف) کائنات مادے کے ذرات پر مشتمل ہے جو مکان میں گھوم رہی ہے۔ زندگی سمندر کے ساحلوں پر نمودار ہوئی اور یہ قدرت کی طاقتیں مثلاً سورج، بارش، گرمی، سردی سے عمل کاری آتی ہیں۔ انبیاء کا نظریہ زندگی کا ایک نظریہ ہے۔

(ب) زندگی ایک حرکی قوت ہے اور یہ مادے سے آزاد ہے۔ زندگی مادے میں اپنے خاص وقت میں داخل ہوئی۔ اُس میں جان ڈالی۔ یہ نظریہ زندگی کی تخلیقی قوت کو مادے سے مختلف وماوراء سمجھتا ہے بلکہ مادے کو زندگی کے زندہ نامی اجسام میں استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا زندگی اور مادہ دواصول کائنات میں کام کر رہے ہیں۔

(ج) زندگی تخلیق کے خصوصی عمل کا نتیجہ ہے تخلیق کا مطلب عدم سے وجود میں لانا ہے جو پہلے موجود نہ تھی۔ یہ نظریہ ایک خدا ہے جو قادر مطلق، بصیر وخبیر، عالم الغیب ہے۔ یہ مذہبی نظریہ ہے انجیل اور قرآن اس کی تائید کرتے ہیں۔ (۲۶)

بریفالٹ لکھتا ہے:۔

"نسل انسانی کا عزم ہمارے اندر بہت طاقت ور ہے اور ہم ایک خاص حد تک

ہی ''افراد'' کہلاتے ہیں۔ اگر نسل انسانی کی تناسلی تحریک محو نہ ہوگئی تو اس کی خواہشات اور نسلی ترقی بھی معدوم نہ ہوگی۔ انسان اپنی حالت کے باوجود انسانیت سے گہرا شغف رکھیں گے۔'' (۲۷)

زندگی کے مختلف پہلو ہیں جن میں انفرادی پہلو عمرانی یا اجتماعی پہلو، بین الاقوامی پہلو، معاشی پہلو، قانونی پہلو، ثقافتی پہلو اور تعلیمی پہلو وغیرہ ہیں۔ زندگی کے انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی پہلو میں حرکت ونمو کا فلسفہ یوں پیش کیا ہے:

- زندگی انفرادی پہلو میں ایک مجموعہ اضداد ہے۔
- زندگی اجتماعی پہلو میں اطاعت وانحراف کے تضاد پر مشتمل ہے۔
- زندگی بین الاقوامی سطح پر عداوت وعناد اور اُس کے جوابی عمل جنگ در جنگ پر مشتمل ہے۔ (۲۸)

اصلاح کا مرکزی نکتہ جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو ایک خدا کے اقرار، فجور وتقویٰ کے امتیاز، نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس کو اجاگر کر کے اخلاقی وروحانی الذہن افراد کی تیاری ہے۔ انسان کی ذہنی تیاری اور یقین محکم کے لیے علم کا حصول بنیادی شرط ہے۔ علم کی دوصورتیں ہیں علم بالوحی اور علم بالانسان۔ ڈاکٹر صاحب ان دوصورتوں میں امتیاز ہر حال میں برقرار رکھنے پر مصر ہیں اور یہ اُن کی فکر کا گہرا اور دوررس نکتہ ہے۔ وہ علم بالانسان کو مسترد نہیں کرتے بلکہ انسانی علم کے ارتقاء کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی ارتقاء یعنی غلطی سے سیکھ کر درست کرنے کا انسانی عمل علم بالوحی کے برعکس نہیں بلکہ اُس کی تعبیر وتشریح ہے۔ البتہ اصل اور تعبیر وتشریح یا جوہر اور اُس کے مضمرات میں فرق کو ملحوظ خاطر رکھنے پر ڈاکٹر صاحب زور دیتے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کی نمو کے لیے ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''انسانی استعداد کا زائیدہ فکر وفلسفہ جن مراحل سے گذر کر انسانیت کو فکری تضادات میں مبتلا کر گیا، اُن سے نکالنے کے لیے یہ جدوجہد ضروری ہے۔

انسانی استعداد کا زائدہ فکر وفلسفہ اپنی نشوونما کی تکمیل کا رُخ علم بالوحی کی روشنی میں صحیح کرے کیونکہ یہ نشوونما اقدام وخطا کے انداز میں ہوئی ہے۔"(۲۹)

س۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی معاشرتی موثرات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے بدل جانے سے زندگی بدل جاتی ہے۔ اُن کے نزدیک:

"موثرات زندگی میں علم، اخلاق، مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست، تعلیم اور ثقافت داخل ہیں۔ زندگی میں دو قسم کی تبدیلیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جو ہمیشہ سے کامل ہیں، وہ اخلاق ومذہب ہیں۔۔۔ ارتقاء پذیر اقدار میں علم، معاشرت، معیشت، سیاست اور تعلیم داخل ہیں۔ ان اقدار میں ترقی انسانی جدوجہد سے ہوتی ہے۔"(۳۰)

معاشرتی تغیر وتبدل، ترقی وتنزل اور عروج وزوال کے پس منظر میں "موثرات زندگی" کی ایک جامع ومانع اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ اخلاق کے بارے میں دو نظریے یعنی کسی مصلحت کو پورا کرنا اور دوسرا بذات اعلیٰ ترین مقصود ہو۔ جبکہ معیار مقصد یا قانون ہے۔ مقصد کے معیار ہونے کا مطلب کہ جو فعل مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، نیکی ہے اور جو رکاوٹ ہے، وہ بدی ہے۔ وحی کی رو سے حکم معیار ہے۔ حکم کی بجاآوری نیکی اور خلاف ورزی بدی شمار ہوگی۔ مذہب سے زندگی کا ہر پہلو متاثر ہوتا ہے۔ مذہب کا حکم یہ ہے کہ موثرات زندگی مذہب کی رو سے متعین ہوں۔ اخلاق ومذہب غیر ملکی اقتدار کے غالب آجانے سے بدل گئے۔ اخلاق مصلحت کوشی اور مذہب موثرات زندگی سے الگ ہوکر محض نجی، شخصی یا باطنی پہلو کا جز بن گیا۔

موثرات زندگی جو انسانی جدوجہد سے وجود میں آتے ہیں، ترقی کرتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے بدل جانے سے وجود خطرے میں، ترقی تنزلی میں اور آگے بڑھنے کی رفتار رک جاتی ہے۔ مسلم دنیا ترقی وبلندی کی منازل طے کرنے کے بعد سست ہوئی تو سیاسی اقتدار کھو بیٹھی اور سیاسی اقتدار کے کھونے سے سارے موثرات استعماری

طاقتوں نے بدل ڈالے۔ علم کے معاملے میں ڈاکٹر صاحب انسانی جدوجہد سے حاصل علم کو ''علم آدم لاسماء کُلھا'' (۲:۳۱) کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور انسانی علم کو پوری اہمیت دیتے ہیں۔ البتہ یہ انسانی جدوجہد کا ارتقائی عمل ہے اس لیے یہ یکدم بے خطا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے مقابلے میں وحی کا علم ہمیشہ سے خطا سے پاک ہے، حتمی ہے اور حکم ہے اور یہ کہ قرآن مجید کا خصوصی مقصود عمل ہے۔ علم کا مسئلہ یہ ہے کہ مقصود حاصل کیسے ہو۔ معاشرت ایک موثر حیات کی حیثیت سے بنیادی اکائی ہے۔ معاشرت کے ارتقاء کی تکمیل کا رُخ یہ ہے کہ وہ اپنی نشوونما میں الہامی مقصود کے ساتھ ساز گار ہو۔ معیشت کی نشوونما بھی اقدام وخطا اور بصیرت دونوں طرح ہوسکتی ہے۔ اقدام وخطا کے تحت معیشت ترقی پذیر ہوگی اور بغیر بصیرت کے ہوگی تو اُس کا تعلق اخلاق سے منقطع ہوجائے گا۔ سیاست ایک عمرانی معاہدہ کے تصور پر مبنی ہے اگر یہ اطاعت کا عوام سے مطالبہ لوگوں کی فلاح وبہبود کی خاطر کرے نہ کہ ہوس اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کے لیے۔ نظام تعلیم میں ٹیکنالوجی اور سائنس کو جو اہمیت حاصل ہوگئی ہے وہ مذہبی علوم کو حاصل نہیں ہے اور زندگی ان احوال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی بات کا اثر ثقافت پر پڑتا ہے۔ ثقافت پرانی نسل سے نئی نسل کو منتقل ہوتی ہے۔ اخلاقی تبدیلی ثقافتی تبدیلی پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی طرح دوسرے موثرات زندگی کے بدلنے سے ثقافتی اقدار میں تبدیلی آتی ہے یہ تبدیلی مقصود کے خلاف ہوتو ثقافتی تبدیلی بھی مقصود کے خلاف جائے گی۔

ح۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے فکری طاقت کے ساتھ مسلح طاقت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ بین الاقوامی زندگی میں ریاست کا تصور بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ریاست سیاسی طور پر منظم ایسے معاشرے کا نام ہے جسے اپنی بقا اور توسیع کے لیے دوسری ریاستوں سے صلح وجنگ کا اختیار حاصل ہو۔''(۳۱)

فکری طاقت کا منبع قرآن مجید ہے۔ ''حجتہ من بعد الرسل'' ہے۔ جس کی ہدایت حتماً قطعاً اور یقیناً نتیجہ خیز ہونے کی ضمانت، حکمت قرآنی اور اس میں مضمر کائناتی قوانین اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں مضمر ہے۔(۳۲)

اس جدوجہد میں فکری منبع قرآن مجید ٹھہرا۔ مسلم معاشرہ زوال وغلامی کی تصویر ہے۔ معاشرت میں زندگی کے حیاتیاتی تقاضے پورے ہورہے ہیں۔ نفسیاتی میدان میں زندگی تشکیک کا شکار ہے۔ مسلم معاشرہ نصب العین نہیں رہا اور ترقی بھی نصب العینی نہیں۔ اسی لیے تمام مسلم دنیا کو معیار دنیا میں تیسری دنیا قرار دیا جاتا ہے۔ جو قومیں نفسیاتی میدان میں نصب العینی نہیں رہتیں وہ اوپر والے درجے سے گر کر محض حیاتیاتی درجے پر آجاتی ہیں جہاں زندگی کے حیاتیاتی تقاضے پورے ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ درجہ کسی طرح قومی نہیں ہوتا کیونکہ محض حیاتیاتی تقاضے تو حیوانی سطح کے باور ہوتے ہیں۔

اگر یہ درست ہے اور بلاشک وشبہ درست ہے کہ قرآن مجید ہی ہمارا فکری منبع اور حجتہ من بعد الرسل ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ مطالعہ قرآن کیسے کیا جائے؟ فہم قرآن کی نئی راہیں دریافت کی جائیں۔ مسلم معاشرت کی نئے سرے سے تہذیب اور اُسے نصب العینی بنانے کے لیے قرآنی حکمت عملی تشکیل دینی پڑے گی۔ مسلم معاشرت جہاں اس وقت ہے اور ٹھہراؤ کا شکار ہے۔ زوال آمادہ ہے۔ آگے بڑھنے کی کوئی تڑپ اور ولولہ اجتماعی طور پر موجود نہیں ہے۔ محض حیاتیاتی تقاضوں کی بہتری ہی کو قومی ترقی سمجھا جارہا ہے حالانکہ قومی ترقی کسی نصب العینی جدوجہد سے آگے بڑھتی ہے۔

مطالعہ وفہم قرآن کا نیا منہاج موجودہ مسلم معاشروں کی تہذیب کا فریضہ انجام دے تو بغیر انتشار کے نتائج لانے کی کوشش ہوگی۔ علم جدید کے زیر اثر زیادہ تر مسلم معاشرے رواں دواں ہیں۔ علم جدید نے زندگی کو حرکت دی ہے۔ یہ قرآن مجید سے بغاوت کا نتیجہ نہیں ہے۔ علم جدید نے انسان کو شعور وترقی دی ہے۔ اسے نظر انداز کرنا

درست نہ ہوگا۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے علم جدید اور فہم قرآن کے نئے منہاج کے درمیان تطبیق کی زبردست کوشش کی ہے۔ اُن کا یہ مطالعہ کہ:

''اب اگر علم بالوحی کے انسانی علم کے نمونے پر ڈھل جانے سے یہ اعتماد فنا ہوگیا ہو کہ قرآن علم بالوحی ہے جو حصول غایت کا ضامن لائحہ عمل مہیا کرتا ہے تو اس اعتماد کو علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان امتیازات کا شعور بحال کر کے اور انسانی علم کو علم بالوحی کی روشنی میں نشوونما دے کر نتیجہ خیزی کی ضمانت فراہم کی جائے۔'' (۳۳)

علم بالوحی اور انسانی علم کے امتیازات کے شعور کے ساتھ فکر کی نشوونما اور زندگی پر اس کا اطلاق مثبت اثرات پیدا کرے گا اور یہ جدید مسلم معاشرت کے زیادہ حق میں ہے کیونکہ نتائج ہمارے حق میں نہیں آرہے ہیں۔

علم بالوحی یعنی قرآن مجید سے اخذ واستنباط مسلسل علم کے اضافہ کا موجب بنا ہے۔ اس سے اخذ واستنباط کا انداز محکومی کے دور میں بدل گیا اور قرآنی علوم کا کوئی تعلق معاشرت کی حرکت کے علم سے نہیں رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن عملی نتائج کے اعتبار سے ''حجتہ من بعدالرسل'' کے رتبہ سے بظاہر پیچھے آگیا حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔ علم بالوحی کی اہمیت وہی ہے جو پہلے تھی۔ بات اخذ واستنباط کی ہے جو بہرحال انسان کے ذمہ ہے اور خصوصاً اُن انسانوں پر جو اہل علم وفکر ہیں۔ سیاسی غلامی، فکری غلامی پر منتج ہوئی اور زندگی کے تقاضے انسانی علوم سے پورے ہونے لگے۔ علم بالوحی اور علم انسانی کے امتیازات کی بات ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے اسی پس منظر میں کی ہے کہ علم بالوحی یا قرآن کی اہمیت کم نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ بے خطا علم ہے۔ ہاں اخذ کرنے والے غلطی کر سکتے ہیں مگر پھر وہ اس کو درست کر کے انسانی علم کا پائیدار حصہ بن سکتے ہیں۔

تجزیہ:

عصر حاضر میں مثالی معاشرہ کی پہچان درج ذیل اداروں کے استحکام وکارکردگی سے وابستہ ہے۔ یہ ایک معیار و میزان ہے ۔ یہ میرے سوالات ہیں۔ یہ آپ کے بھی

سوالات ہیں۔ آپ اپنے جواب ڈھونڈیں، مرتب کریں، آگے بڑھیں، کھلے ذہن سے اور پورے اعتماد سے آگے بڑھیں۔ میں اپنے سوالات کا جواب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، عصرِ حاضر کے ترقی یافتہ علم کے مطالعہ اور اُس ذاتی بصیرت سے مرتب کروں گا جو مجھے ودیعت کی گئی ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کو سمجھنے میں غلطی لگ سکتی ہے۔ جدید علم سے کماحقہ اگاہی سے محروم ہوسکتا ہوں اور میری بصیرت کی بھی ایک حد ہے۔ مگر آگے بڑھنے کی آرزو مقدم ہے۔ یہ ادارے اور سوالات یوں بیان ہو سکتے ہیں:

۱۔ سیاسی استحکام

۲۔ معاشی استحکام

۳۔ معیارِ تعلیم کی عملی و اطلاقی نوعیت۔

۴۔ افرادِ معاشرہ کے لیے طبی سہولت کا معیار۔

۵۔ انصاف کی عام نوعیت، کیفیت اور حقوق انسانی۔

ریاست ومعاشرہ اور سیاسی استحکام لازم ملزوم ہیں۔ سیاسی استحکام کی اصطلاح محض کسی معاشرہ و ریاست کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے دو اقسام بیان کی ہیں یعنی اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی معاشرہ یا اسلامی ریاست اور سیکولر ریاست۔ اس تقسیم کے مطابق تمام مسلم ممالک کے معاشرے اسلامی ہونے چاہیں اور قرآن وحدیث کی فکر پر معاشرہ وریاست استوار ہونے چاہیں اور دنیا کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں تمام اسلامی ریاست میں سیاسی استحکام مثالی ہونا چاہیے اور اقتصادی لحاظ سے لوگ خوشحال ہونے چاہیں۔ معاشرتی لحاظ سے بے خوف وخطر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ بدقسمتی سے اسلامی ریاستیں اس کے برعکس نقشہ پیش کرتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب اسلامی ریاستوں کو مسلم ریاست کی اصطلاح دی گئی ہے یعنی مسلم ریاست جس میں مسلمان تو بستے ہیں مگر اسلامی یا قرآنی اصول وضوابط نافذ العمل نہیں ہیں۔ دوسری

طرف غیر مسلم معاشرے یا سیکولر ریاستوں نے اپنے شہریوں کو ترقی کے بام عروج پر پہنچا کر انسانی ترقی و بہبود کا ایک معیار قائم کر دیا ہے۔ انسان کی بصیرت اور حرکی استعداد کو انسانی ترقی وعظمت کے ساتھ معاشرت وریاست کو مثالی استحکام بخشا ہے۔ مسلم ریاستیں ترقی وعظمت کے متوازی جارہی ہیں۔ ایسے میں مسلم دنیا کے حکماء وعلماء وصوفیاء اور خلفاء کو سوچنا ہے کہ وہ انسانی ترقی وعظمت کی راہ پر کیسے آسکتے ہیں۔ آگے کیسے بڑھ سکتے ہیں اور باقی کیسے رہ سکتے ہیں، مسلم ریاست ہو یا سیکولر معاشرہ یا ریاست۔ زندگی کے انفرادی ،اجتماعی اور بین الاقوامی پہلو میں نظم وضبط اور قومی نصب العین سے محبت ،کارگزاری اورنتائج کا تعین کرتی ہے۔ مسلم دنیا کی بہتری واستحکام خود مسلم ریاستوں کے حکماء، علماء ، صوفیاء ،خلفاء اور عوام الناس نے لانا ہے۔ سابقہ طریق کار ناکام ہو چکا ہے۔ نیا منہاج اختیار کرنا پڑے گا۔ منہاج علی وجہ بصیرت مسلم حکماء، علماء، صوفیاء اور خلفاء کو تراشنا ہوگا۔ یہ بالکل نیا منہاج ہوگا۔ اس نئے منہاج کا مسلم معاشروں وریاستوں پر اطلاق کرنا ہوگا۔ اس منہاج کا ضمیر مسلم دنیا سے اُٹھے گا، اطلاق ہوگا اور نتائج آئیں گے۔ منہاج کی تیاری میں بلکہ اطلاق کی حکمت عملی میں بھی سائنس وفلسفہ یعنی عقلیت وحسیت، علم جدید کا منہاج، سیکولر ریاستوں کا منہاج اور اطلاق کی حکمت عملی سے جہاں اور جتنا ممکن ہے، استفادہ حاصل کرنے میں حرج نہیں ہے۔ اس کی دو وجوہات بڑی واضح ہیں:

اول: تمام مسلم ممالک اوراُن کے معاشرے گذشتہ چند صدیوں سے علم جدید اور بین الاقوامی سیکولر ریاستوں کے زیر اثر ہیں۔ عقلیت وحسیت کے تحت ذہن بھی بنا ہے۔ تہذیبی تبدیلیاں بھی بین الاقوامی نوعیت کی ہیں۔ معیشت وسیاست میں مغربی افکار کا مکمل عمل دخل ہے گویا مسلم معاشرے تبدیلی کے ایک عمل سے گذر چکے ہیں۔ نصب العین کے حوالے سے تراش خراش کی ضرورت ہے۔

دوئم: مسلم معاشرے اورریاستیں جتنی تبدیلی سے گذر چکے ہیں، اُن میں سے جو ترقی

وبہبود کے لیے کارآمد ہے، جاری رہے گا اور جو مسلم معاشروں وریاستوں یا دوسرے لفظوں میں اسلامی نصب العین کے خلاف جو کچھ ہے، اُس میں مثبت تبدیلی لاکر، اُس کی تہذیب کر کے اُسے اسلامی نصب العین کی راہ پر ڈالنا ہے۔ چونکہ یہ سارا کام مسلم حکماء، علماء، صوفیاء اور خلفاء نے کرنا ہے، اس لیے یہ تبدیلی ممکن ہے۔

علماء کا ایک روایتی طبقہ موجودہ معاشرہ وریاست کی ہر چیز کو مسترد کرتا ہے۔ جو اثرات مسلم دنیا پر مرتب ہو چکے ہیں، انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ زندگی کے تقاضے مسلم ریاستوں ومعاشروں میں موجودہ صورت حال میں بھی پورے ہو رہے ہیں، محض نصب العین زندگی کا محرک نہیں ہے۔ زندگی کے چھوٹے مقاصد نصب العین کی صورت اختیار کر گے ہیں مگر زندگی مسلمانوں کی کسی انداز سے سہی گذر رہی ہے۔لیکن علماء کرام کا ایک طبقہ نئے سرے سے قرون اولیٰ یا وسطیٰ جیسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ آرزو خوبصورت ہے لیکن یہ بات حکمت عملی کے خلاف ہے کہ وقت پیچھے جائے گا۔ قرون اولیٰ یا وسطیٰ جیسے قرآنی فکر کے ماتحت معاشرہ وریاست قائم کر سکتے تھے، کر چکے ہیں۔ وہ منہاج آج نتائج نہیں دے سکتا۔ دنیا بدل چکی ہے۔ انسان بدل چکا ہے۔ مسلمان بدل چکا ہے۔ مسلمان اب اُس طرح نہ رہتا ہے نہ سوچتا ہے۔اب تبدیلی نئے منہاج اور نئی حکمت عملی سے وابستہ ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم نکتہ کی نشاندہی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے کی ہے:

''دور مابعد نبوت کے صحیفہ انقلاب کی نوبت آہی جب سکتی ہے جب اُمت مسلمہ ایک دفعہ قرآنی ہدایت کے زیر اثر بین الاقوامی عروج پر فائز ہونے کے بعد زوال پذیر ہو جائے اور مؤثرات حیات بالکل بدل جائیں اور بین الاقوامی سطح پر جدید جاہلیت غالب آگئی ہو تو یہ جستجو لازم آئے گی کہ بین الاقوامی زندگی میں فساد کے سرچشمے کو متعین کیا جائے جس کے اثر سے پہلے قومیں اور معاشرے تباہ ہوئے ہیں ۔ پھر افراد کی جزو فلاح سے انا ساز گار احوال پیدا ہوتے ہیں۔ اب قرآن مجید نازل ہو چکا ہے اور اُمت مسلمہ ایک دفعہ بین

الاقوامی سطح پر غلبہ حاصل کر چکی ہے لہذا موجودہ حالات کے پیش نظر بین لاقوامی نصب العین کے حوالے سے اُمت مسلمہ زندگی کے اجتماعی پہلوؤں کی اصلاح کے لیے دور مابعد نبوت کے صحیفہ انقلاب یعنی قرآن مجید کی ترتیب تلاوت سے ہدایت طلب کرے۔

ریاست میں سیاسی استحکام کے معاملات ونظریات پر ہر صدی میں حکماء نے گراں قدر کام کیا ہے۔ لیکن موجودہ سیاسی فکر کی پشت پر دو افراد کا گہرا اثر باور کیا جاتا ہے۔ یہ کوتلیہ چانکیہ کی کتاب ''ارتھ شاستر''(۳۵)اور نکولو مکیاولی کی ''پرنس(۳۶) ہیں۔ مسلم دنیا کے پس منظر میں ابن خلدون اور علامہ محمد اقبال نمایاں شخصیات ہیں۔ابن خلدون اورنکولو مکیاولی کا موازنہ بھی کیا جاتا ہے۔ مکیاولی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے وہ کچھ منظم طریقے سے بیان کیا جو حکمران کرتے ہیں نہ کہ وہ جو انہیں کرنا چاہیے۔ ریاست ومعاشرہ کی نشوونما بتدریج ہوئی ہے۔ اس میں مسلم ملوکیت کی بحث میں جس کے تحت ریاست ومعاشرہ حرکت پذیر رہتے ہیں، آخری ایڈیشن رائج الوقت نظام ونعرہ ''جمہوریت'' ہے۔ جمہوریت کو محض مغربی اصطلاحوں اور مغربی فکر کے تحت ہمارے زعماء خصوصاً علماء بیان کر کے اُس کی خامیاں اجاگر کرتے ہیں لیکن اسی جمہوریت کے تحت اُن ممالک نے جو ترقی کی اور آفاقی انسان کو جو دیا، اُسے زیر بحث نہیں لاتے۔ بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی سیاسی استحکام کی نظریاتی طور پر بحث کرتے ہیں مگر جمہوریت کو اکثر یتی گناہ گاروں کی حکومت کہتے ہیں اور قبول نہیں کرتے ہیں۔ یہاں وہ ڈاکٹر علامہ اقبال کے افکار کی تائید کرتے نظر نہیں آتے۔ علامہ اقبال نے ''روحانی جمہوریت''(۳۷) کی اصطلاح استعمال کر کے موجودہ جمہوریت اور اسلامی نقطہ نگاہ میں تطبیق کی زبردست کوشش کی۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی بھی تطبیق کے زبردست موئید ہیں مگر یہاں وہ تطبیق کا نظریہ اپنانے سے گریزاں ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''جمہوریت کی علمیاتی اساس یہ ہے کہ صرف حواس ذریعہ علم حقیقت ہیں اور صرف محسوسات حقیقت ہیں۔ یہ نتیجہ وجودیات کے سلسلے میں برآمد ہوگا۔ اگر وجودیات کی

رد سے صرف محسوسات کو حقیقت سمجھا جائے تو تمام ماورائی حقائق کا انکار لازم آئے گا جنہیں ثابت کرنے پر وحی کو اصرار ہے۔''(۳۹)

علامہ محمد اقبال نے ''روحانی جمہوریت'' کا تصور دے کر یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔ جمہوریت مسلم ممالک میں ہوگی تو وہاں صرف محسوسات پر مدار نہ ہوگا۔ وحی مدار ہوگا اور ماورائی حقائق پر مسلمانوں کا آپ ﷺ اور قرآن مجید کے حوالے سے عقیدہ ناقابل شکست ہے۔ تطبیق دراصل یہی ہے جس پر علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی متفق ہیں۔

سیاسی مسلک میں علامہ اقبال کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے زمانہ ووقت کی مناسبت سے سیاسی نصب العین کے تعین کی بات کی ہے۔انہوں نے ابن خلدون کی متعین کردہ تین آراء کو بیان کر کے دوسری رائے کو ترکوں کے حوالے سے اجاگر کیا ہے۔ ابن خلدون کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ خلافت کا قیام امر شرعی ہے یا یہ کہ اس کا تعلق ضرورت ومصلحت سے ہے یا اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ یہ تینوں نظریات ابن خلدون نے ماضی اور اپنے زمانے کے تجربات اور گروہوں کے نظریات کے حوالے سے بیان کیے ہیں۔ علامہ ترکوں کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اپنے سیاسی تفکر میں ماضی کے سیاسی تجربات سے سبق حاصل کریں جس کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ عالمگیر خلافت اب ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً آزاد وخود مختار ریاستوں کے قیام کے بعد اور مشکل ہوگیا ہے بلکہ خلافت کا عالمگیر تصور ریاستوں کے اتحاد میں رکاوٹ ہے۔ ترک سیاسی رویہ ابن خلدون کی دوسری رائے کی طرف ہے اور علامہ اقبال نے بھی اس کی تائید کی۔ علامہ لکھتے ہیں :۔

''میری اپنی رائے بھی یہی ہے کہ اگر ان دلائل کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا جائے تو اس مطلب یہ ہوگا کہ ہمارا ذہن اب ایک ایسے بین الاقوامی نصب العین کی طرف حرکت کر رہا ہے جو گویا اسلام کا منتہائے نظر ہے مگر جس کو شروع شروع کی عربی شہنشاہیت نے پس پردہ نہیں بلکہ پس پشت ڈال رکھا تھا۔''(۴۰)

یہ ضرورت بھی تھی اور مصلحت بھی کہ علامہ اقبال نے جدید جمہوریت کو بطور ریاستی نظریہ قبول کیا۔ جمہوریت ہر ریاست میں الگ سے کام کرتی ہے اور مختلف ممالک میں اس کی شکل ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف بھی ہے لیکن بنیادی مسئلہ حکومت میں لوگوں کی شرکت ہے اور خلافت میں بھی یہ اصول تھا۔ علامہ نے اسے روحانی جمہوریت کا نام دیا کہ ہم اپنے حالات کی مناسبت سے اور اپنے مذہبی عقائد کی مناسبت سے اختیار کر سکتے ہیں۔ علامہ نے مختلف اسلامی ریاستوں کو اسلامی جمہوریت (۴۱) کے تحت آگے بڑھنے اور پھر ایک اتحاد کی صورت اختیار کرنے کی فکر دی تھی۔ یہ فکر اگر نشوونما پاتی تو آج اسلامی ممالک جمہوریت کے تحت یورپ کی مشترکہ یونین جیسا روپ دھار سکتے تھے۔ خلافت کا اس کے سواء کیا مطلب ہے کہ مسلمان ریاستیں یا آزاد صوبے ایک مشترکہ تنظیم کے تحت ہوں اور اسلامی نصب العین کے حصول کے لیے مشترکہ کوششیں کریں۔

سیاسی استحکام کے لیے مسلم ریاستوں کو جمہوریت کے تحت اقتدار میں عوامی شرکت کو صاف وشفاف بنانا ہوگا اور وحی کی روحانی قوت سے عوامی اذہان وقلوب کو نصب العین کی طرف حرکت کا سبق دینا ہوگا۔ جمہوریت کے تحت عقلیت کو اپنا مقام حاصل ہوگا تو حسیت کو اپنا جبکہ وحی کی اپنی اہمیت ہے۔ مسلم ممالک میں اس تکون کو جمہوریت بننے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

اس بحث کے آخری حصے میں چوہدری مظفر حسین کا نقطہ نظر بیان نہ کرنے سے یقیناً یہ موضوع تشنہ رہے گا۔ دو اقتباسات سے اُن کی فکر کو عیاں کروں گا۔ اپنی کتاب ''روحانی جمہوریت'' میں لکھتے ہیں:

> ''مغربی جمہوریت کے مقابلے میں علامہ اقبال نے روحانی جمہوریت کا جو تصور دیا ہے۔ اسے وہ اسلام کا منتہائے مقصود قرار دیتے ہیں لہذا یہ ایک ایسا تصور ہے جو جوہری اعتبار سے ایک خالص دینی تصور ہے۔ اس تصور کی اساس ''تکریم آدمی'' (لقد کرمنا بنی آدم) پر ہے۔''(۴۲)

مغرب نے انسانی سہولتوں کے لیے انسان ہی کو صنعت وحرفت کی مشین قرار دے کر دراصل فرد کی شخصیت نظر انداز کر دی۔ وحی کی روحانی قوت کی موجودگی میں یہ ''تکریم آدمی'' پر استوار ہوگی۔ مزید لکھتے ہیں:

''رائج الوقت جمہوریت کا جوہر آزادی فکر اور آزادی رائے ہے اور قرآن انسان کے اس بنیادی حق کو تسلیم کرتا ہے۔ ہر نبی اور رسول کی دعوت اسی پر تھی۔'' (۴۳)

دنیائے اسلام کے ممتاز مفکرین کی جانب سے جمہوریت کو ریاستی نظام کے مطابق قرار دینے اور بیسویں صدی کے سب سے زیادہ فروغ پذیر ریاستی نظام سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ ۵۷ ممالک اور ان کے چوتھائی عالمی آبادی پر مشتمل مسلم دنیا میں سے ۴۹ فیصد کا اعلانیہ سرکاری مذہب اسلام ہے۔ ۵۱ فیصد ممالک نے اپنے آئین میں سرکاری مذہب کی نشاندہی نہیں کی یا وہ خود کو سیکولر کہلاتے ہیں جبکہ ۱۹ فیصد نے سیاسی نظام میں اسلام کو نظریاتی نظام قرار دے رکھا ہے۔ ۸ ممالک میں کوئی سیاسی جماعت نہیں، ۴ میں اپوزیشن کا وجود نہیں ۵ ممالک کے سیاسی نظام میں اسلامی جماعتوں کے داخلے پر پابندی ہے۔ ریاستی نظام کے ماہرین ریاستی نظام کو دنیا کے حوالے سے ۴ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جن میں مکمل جمہوری ممالک، ناقص جمہوریت کے حامل ممالک، دوہرے معیار کی جمہوریتیں اور مطلق العنان حکومتیں۔ ''مکمل جمہوری ممالک'' کے پیمانے پر پورا اُترنے والے ۳۰ ممالک کی فہرست میں ایک بھی اسلامی ملک نہیں دوسرے درجے، ناقص جمہوری ۵۰ ممالک میں سے صرف ۲۔ اسلامی ممالک (ملائیشیا اور انڈونیشیا) ہیں اور پاکستان سمیت ۲۱.۴ فیصد اسلامی ممالک (مالدیپ، فلسطین، ترکی، بنگلہ دیش، سینیگال، سیری لیون، کرغزستان اور عراق) میں دوہرے معیار والی جمہوریتیں جبکہ ۳۷ فیصد (۳۱) اسلامی ممالک مطلق العنان حکومتیں قائم ہیں۔ متعدد اسلامی ممالک میں طویل عرصے سے خاندانی یا شخصی حکومتیں قائم ہیں۔ (۴۴)

مالی استحکام سے سیاسی استحکام اور معاشرتی استحکام آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ سیاسی استحکام ومعاشرتی استحکام سے مالی استحکام آتا ہے۔ یعنی سب کا استحکام ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ سیاسی میدان میں مسلم دانش منفی یا مثبت سرگرم عمل رہی ہے لیکن مالی میدان میں مسلم دانش کا کردار نہ ہونے کے برابر ہے۔ دور جدید میں بھی زیادہ سے زیادہ نظریاتی بحث کی ہے۔ عملی لائحہ عمل پر کام نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے بھی معاشی پہلو پر نظریاتی سمتوں کے تعین کی کوشش کی ہے:۔

''ازروئے قرآن معاشی تخلیق کی جدوجہد میں تعطل دور کرنے کا عمل اسلامی معیشت ہے اور جن لوگوں کی زندگی میں تعطل موجود ہے۔ ان کو وسائل مہیا کرنا ہی اسلامی معیشت ہے۔''(۴۵)

اسلام معیشت کی تعریف یہ ہے کہ معاشی تخلیق کے تعطل کو کیسے رفع کیا جائے۔ اب جو ریاست ایسا تعطل رفع کرے گی تو وہ اپنے لوگوں کے معیار واخلاق کے مطابق کرے گی۔ دوسری بات کہ ہمارے زوال سے پہلے معاشی تعطل جاگیرداری نظام سے رفع کیا جاتا تھا جب کہ تاریخی انقلاب کے تحت جاگیرداری نظام سے زیادہ دولت پیدا کرنے والے نظام معرض وجود میں آگئے اور انہوں نے جاگیرداری نظام کی جگہ لے لی۔ مسلم دنیا جاگیردرانہ نظام کے متبادل معاشی دنیا میں کوئی اور نظام نہ لاسکی اور مسلم دنیا میں زندگی کے تقاضے صنعتی سرمایہ دارانہ نظام سے پورے ہونے لگے۔ گویا مسلم دنیا تخلیق دولت کا متبادل نظام نہ دے سکی اور موجودہ نظام کے تابع آگئی۔

اسی سرمانہ درانہ نظام کے تحت مغرب اور کئی دوسرے ممالک نے حیران کن ترقی کی۔ معاشی تخلیق کے کئی ٹھکانے تلاش کیے۔ اپنے انسان کو آسودہ کیا بلکہ پوری دنیا کو راہنمائی دی۔ لیکن مسلم دنیا اس کو اپنانے کے باوجود معاشی تخلیق کا نظام وضع نہ کرسکی۔ اس کی چند وجوہات سامنے آتی ہیں:

۱۔ سیاسی نظام میں عدم استحکام

۲۔صنعتوں سے گریز

۳۔بینکنگ کے نظام کو اپنانے کے باوجود حرام قرار دینا

۴۔سود کی تعریف معیشت دان کے بجائے علماء کرام کے ذمہ

معیشت کا معیار اعداد وشمار ہیں جو ریاستوں کے معاشی تخلیق کے پس منظر، ذرائع اور نمو پر مدار کرتے ہیں۔

یہ اعداد وشمار کی کہانی ہے جو معیشت کو جانچنے کا ایک معیار ہے۔ ایک اقتصادی ماہر کا خیال ہے:

> ''روٹی، کپڑا اور مکان عوام کے لوازمات میں سے ہیں لیکن یہ لوازمات اُس وقت ہی پورے ہوسکتے ہیں جب ملک میں معیشت مستحکم، سرمایہ کاری، برآمدات اور پیداوار میں اضافہ ہو اور روزگار کے مواقع مہیا ہوں۔ شروع سے ہی پاکستان میں گلوبلائزیشن، لبرلائزیشن، پرائیویٹائزیشن اور ڈی ریگولیشن پر عمل درآمد رہا ہے جب کہ یہ عوامل ترقی پذیر ممالک کے بجائے ترقی یافتہ ممالک میں زیادہ سودمند ہیں۔''(۴۷)

یہ اقتباس خصوصی طور پر پاکستان کے پس منظر میں بیان ہوا ہے۔ کسی سیاسی نعرے سے قطع نظر روٹی، کپڑا ،اور مکان زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ نظریاتی واخلاقی بحث اس کے بعد کا منظر ہوتا ہے۔ یہ پاکستان اور مسلم دنیا کا المیہ ہے کہ یہاں انسان کی قدر سب سے کم ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کا نظام زر ابتداء سے ہی بین الاقوامی نظام زر کا حصہ رہا ہے۔ تمام مالیاتی اداروں سے پاکستان کا تعلق رہا ہے۔ قرض لیتا رہا ہے اور واپس کرتا رہا ہے۔ البتہ علماء کرام سود حرام ہے کے فتوؤں سے اس نظام زر پر تنقید کرتے ہیں۔ ان فتوؤں کی وجہ سے قوم نیم مردہ، نیم مسلمان اور نیم کافر قرار پاتی ہے۔ ریاستی حکمران اپنے جاہ وجلال کو باقی رکھنے کے لیے جائز و ناجائز قرضے لے کر قوم کو گروی رکھ رہے ہیں اور علماء کرام محض فتوؤں سے قوم کی حرکت پر روک لگاتے رہتے

ہیں۔ مالیاتی نظام بہت گہرا اور پیچیدہ عمل ہے۔ اس کا بہرحال ایک حل درکار ہے جو بالآخر ہمیں ہی کرنا ہے۔

نیم مردہ، نیم مسلمان اور نیم کافر سے حلال، حلال نہیں رہتا اور حرام، حرام نہیں رہتا، اس کی تمیز کے لیے زندہ مسلمان کو وجود درکار ہے۔ زندہ مسلمان معاشی میدان میں آگے بڑھے گا تو وہ حلال نصب العین کے تحت آگے بڑھے گا۔ زندہ مسلمان حلال وحرام کی خود تمیز کرے گا۔ معاشی تخلیق کے اداروں میں صنعتیں ہیں جو دولت کا سبب بھی ہیں اور اشیاء کا سبب بھی۔ صنعت سے اشیاء تیار ہوتی ہے۔ مزدور کی محنت سے تیار ہوتی ہیں۔ صنعت کو مزدور کے مذہب سے تعلق نہیں ہوتا، اُس کی کارکردگی سے ہوتا ہے۔ مزدور کو مزدوری ملتی ہے جو حلال ہوتی ہے۔ ہر مذہب کا اخلاقی نظام اس کا پابند ہے کہ مزدور کو مناسب ومعاہدہ کے تحت مزدوری دی جائے۔ ریاستی قوانین بھی مزدور کو یہ حق دیتے ہے۔ اشیاء جو تیار ہوتی ہے، ساری دنیا میں اُن کی کھپت ہوتی ہے اور ہر مذہب کا شخص اُن کو استعمال کرتا ہے۔ صنعتی اداروں کے تحت معاشی تخلیق کے عمل میں سود حلال ہے یا حرام ہے، کی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

سود حرام ہے، کی بحث زیادہ تر ہمارا عالم طبقہ بنکنگ نظام کے حوالے سے زیر بحث لاتا ہے، اب ناگزیر عمل اور مجبوری یہ بن چکی ہے ہر عالم اور ہر مسجد کا اکاوٹ بنکوں میں ہے۔ اضافی رقم اکاونٹ پر کوئی لے یا نہ لے، بینک اُس رقم کو اپنے سودی کاروبار میں پوری طرح استعمال کرتا ہے۔ بینک کا نظام ہی اسی پر استوار ہے۔ علماء کرام نے متبادل بینک کے نظام کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ متبادل بنکاری اسلامی بنکاری کہلاتا ہے۔ نظام زر اور نظام بینکنگ وہ ہے جو عالمی سطح پر چل رہا ہے۔ ایک ہی مارکیٹ میں سب بینک کام کرتے ہیں۔ رقم کماتے ہیں اور قاعدے اور معاہدے کے تحت اکونٹ ہولڈر کو ادا کرتے ہیں۔ لیکن یہ کافی ہے کہ علماء کرام اور مسلم بینک کاروں نے ایک راستہ نکالا ہے اور نظام زر پر چھائی

جمود کی کیفیت کو بدلا ہے۔ بینک کاری نظام کی وسعت وناگیزیریت نے آخر اسی نظام زر کو اپنے اخلاقی وایمانی ضوابط کے تحت تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ اور یوں حلال وحرام کے جمود سے باہر نکل رہے ہیں۔اس پر مزید کام کی ضرورت ہے۔(۴۸) اس کے نظریاتی پس منظر کو قرآن وحدیث سے مثبت طور پر اٹھانے کی ضرورت ہے۔قران وحدیث سے مسائل اخذ کرنے کے لیے فقہاء نے ''علت'' (Cause) کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے ''وقت'' کا ایک موثر آلہ قرار دیا ہے جو''وقت'' کی مناسبت سے آمدہ مسائل کو حل کرنے کا طریقہ ہے۔ معاملات حل کرنے کے لیے دوسری حکمت فقہاء نے مصالح کی دی ہے۔کسی معاملہ کے رواج سے انفرادی واجتماعی مصالح کس قدر وابستہ ہیں۔''علت'' کا یہاں معنی ظلم وناانصافی اور انسانی استحصال ہے۔یہ عام اصول ہے جو اسلامی تمدن وفکر کا حصہ ہے اور دور جدید کے مالیاتی نظام میں بطور اصول یہ کارفرما ہے۔یہ الگ بات ہے کہ بازار دولت میں اس پر عمل نہ ہو۔

علت اور انفرادی واجتماعی مصالح بینک کے تکنیکی اصولوں کو مسلم تمدنی پس منظر میں تبدیل کر کے لوگوں کی ذہنی تشکیک کو یقینی دائرہ میں لاسکتے ہیں۔ ناانصافی اورانسانی استحصال کسی بھی معاشرے میں جائز نہیں۔''وقت'' کی ایک مخصوص صورت حال اور مسلم ریاستوں کا محکومی سے آزادی کے سفر کے دوران اپنے اعتماد کو کھو دینا دراصل نظام زر تشکیک کا باعث بنا ورنہ جو کوشش اب شروع ہوئی یہ تب ہوئی ہوتی تو مسلم ریاستوں کا آزادی کی طرف سفر پُراعتماد ہوتا۔

نظام زر کی مسلم تمدن کے پس منظر میں تہذیب وتشکیل کے دو نمایاں مقاصد ہیں:

ا۔ مسلمان مالی لحاظ سے خوشحال ہو اور غربت سے نجات ملے۔

ب۔ خوشحالی کے اس عمل کے دوران حلال وحرام کی تمیز برقرار رہے۔

معاشرہ میں خوشحالی کے تین میدان ہیں جو معیارات کا کام دیتے ہیں یعنی

سیاسی، معاشی اور معاشرتی۔

عصر جدید کے نظام زر کو مسلم تمدن کے فقہی و تکنیکی اصولوں کی روشنی میں آگے بڑھانے کا عمل جاری ہے وہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نئی صورت حال کو مزید بہتر کرنے کے لیے قرآن سے راہنمائی کے لیے نئے سرے سے توجہ مرکوز کی جائے۔ آج کے ''وقت'' کی دوپہر میں بیٹھ کر مطالعہ قرآن کیا جائے۔ جدید تمدن کو مدنظر رکھا جائے۔ جدید ضرورتوں کو زیر غور لایا جائے۔ قوموں کی دوڑ میں معاشی ترقی و خوشحالی کے عنصر کو اولین ترجیح کے طور پر اختیار کیے جانے کے عمل کو دیکھا جائے۔ کاغذی نوٹ کی اہمیت پر توجہ مرکوز کی جائے۔ مسلم ممالک کے مقام کا تعین کیا جائے۔ ان امور کی روشنی میں قرآن سے راہنمائی حاصل کی جانے کی کوشش کی جائے۔ حصول زر کے لیے آگے بڑھنے کی انفرادی واجتماعی سطح پر جس یقین وتسلی کی ضرورت ہے، وہ فراہم کی جائے۔ مسلمان کو یہ باور کرانا ازبس ضروری ہے کہ وہ حصول زر کے لیے کونسا طریقہ اختیار کرے اور کس دائرے میں کرے کہ اُسے حلال کا یقین ہو۔ قرآن حکیم کی چند آیات کے مجموعی تاثر کو ایک مثال کے طور پر یوں دیکھا جاسکتا ہے:

انفرادی سود کی تو وہ پرانی شکل ہے البتہ ریاستی سطح پر جو نظام زر قائم ہے۔ بینکنگ نظام ہر ریاست کی مالی حیثیت کی بنیادی ضرورت بن چکا ہے۔ ریاست خود یہ نظام قائم کرتی ہے بینک جو رقم لیتا ہے وہ ریاستی اجازت سے لیتا ہے اور جو دیتا ہے، ریاستی اجازت سے دیتا ہے۔ بینک کا اولین کام کاغذی نوٹ کی کھاتہ دار کے حق میں حفاظت ہے کیونکہ سابقہ دور میں یہ کاغذی زر مبادلہ نہ تھی۔ دوسرا وہ کھاتہ دار کو ایک معاہدے کے تحت اضافی رقم دیتا ہے۔ اس اضافی رقم کو بینک اصل زر پر منافع کی صورت دیتا ہے۔ بینک ریاستی ہدایت کی روشنی میں لوگوں کو انفرادی اور کمپنی کی صورت میں رقم قرض پر ایک معاہدے کے تحت دیتا ہے۔ فرد یا کمپنی تجارت کرتی ہے اور معاہدہ کے تحت معین رقم بمعہ

اصل احتیاط کے واپس بینک میں جمع کراتی ہیں۔ فرد یا کمپنی مالی خسارے میں جاتی ہے۔ سٹیٹ بینک یا ریاست کی اجازت سے ڈیفالٹ فرد یا کمپنی کو اصل رقم بمعہ اضافی رقم معاف کرتی ہے۔ بظاہر فرد یا کمپنی کا استحصال کے بجائے ریلیف دیا۔ ریاست کا یہ غیر استحصالی اور ذمہ درانہ رویہ ہے۔ لیکن اس عمل کا جو حشر اکثر ممالک خصوصاً پاکستان میں ہوا، نا قابل بیان ہے۔ پاکستان میں تو غربت کی وجہ یہ ہی ہے کہ ریاست نے دوسرے ملکوں یا اداروں سے قرض لیا۔ چند رئیس زادوں نے قرض لیا اور پھر معاف کرالیا۔ ان باتوں کا تذکرہ عصر جدید میں برپا صورت کی عکاسی سے ہے۔

مذکورہ بالا بحث میں دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے کہ ربوا میں انفرادی مخاطبین ہیں اور دوسرا ریاستی استحصال کی صورت ''الرّبوا'' کا معنی سرمایہ پر زیادتی واضافہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ریاست اس پر اقدامات کر کے صورت حال کو قابل بنا سکتی ہے۔ اس ضمن میں قرآنی ہدایت بڑی واضح ہے:۔

''یاایھاالذین آمنوا اطیعو اللّٰہ واطیعو الرسول واولو الامر منکم'' (النساء ۵۹)

معاشرہ کو خوف وغم سے محفوظ بنانا اولوالامر منکم یعنی جو تم میں سے حاکم بنا دیئے گے ،کا کام ہے۔ خوف وغم سے نجات کے لیے روٹی ، کپڑا اور مکان کا اہتمام ،عزت وآبرو کی حفاظت اور معاشی تخلیق کے ذرائع پیدا کرنا کرے۔ یہاں یہ بات یا د رکھنے کے قابل ہے کہ مسلمانوں کو پابند کیا گیا ہے کہ ان کے لیے قابل اطاعت کیا ہے:

ا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم جو حاکم حقیقی ہے (۲) اور مطاع اصلی ہے اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ،جو مطاع مطلق ہے (۳) حاکم وقت، نفاذ حکم کا اختیار رکھنے والے۔ نفاذ حکم کے طریقے حاکم وقت اپنی بصیرت اور اپنے امراء کی بصیرت سے ایجاد کرتا ہے۔ مسلم دنیا میں آمرانہ مطلق العنان حکومتوں سے اسلامی طریق کی روش اور عوامی خواہشات کے برعکس جو نقشہ عصر جدید میں تیار کر رکھا ہے۔ لگتا نہیں کہ قرآن کی فکر ایسے حکمرانوں کے لیے ہے

اور نہ یہ ممکن نظر آتا ہے کہ وہ سود سے پاک، حلال وحرام کی تمیز اور معاشی تخلیق کو اخلاقی جواز بخشنے کی صلاحیت واستعداد کے مالک ہیں۔ قرض معافی اور استحصالی روش کا چند سطریں پیچھے جو تذکرہ کیا گیا ہے وہ ان کی غیر اسلامی روش اور نااہلیت کے لیے کافی جواز ہے۔ ریاستی عمل دخل کی درست صورت ''اولوالامر منکم'' (منکم تم میں سے) کا لفظ قابل توجہ ہے جو عصر جدید کے پارلیمانی جمہوریت کی حقیقی صورت کی حمایت کرتا ہے۔ یعنی عوامی شرکت سے منتخب ہونے والے قوم کے اہل حل وعقد اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے احکامات وفرمان کی روشنی میں مقصود کو حاصل کرنے کی نئی حکمت عملی مرتب کر سکتے ہیں جو کم از کم مسلم ملکوں میں ابھی دور کی بات ہے۔

تیسرا سوال ہماری معاشرت کا ڈھانچہ اور موجودہ نقشہ ہے جس کے لیے قرآن کی بنیاد پر عصر حاضر کے انسانی ترقی کے دریافت شدہ آلہ جات اور حکمت عملی کے استعمال کی ضرورت واہمیت ہے۔ معاشرت کے بظاہر مشہور وبڑے میزآن تین ہیں:۔

۱۔معیار تعلیم ومقدار تعلیم کی عملی واطلاقی نوعیت

۲۔افراد معاشرہ کے لیے طبی سہولت اور معیار صحت

۳۔انصاف وحقوق انسانی کی نوعیت ومعیار۔

زندگی آگے بڑھنے کا نام ہے۔ انسان میں آکر زندگی نے خود آگاہی کا سفر طے کیا۔ ہزارون انبیاء لاکھوں اولیاء اور حکماء اور علماء کی محنت شاقہ نے انسان کو شعوری زندگی کے راستے پر ڈالا اور شعوری زندگی ایک بلند درجہ پر فائز ہونے کے بعد آخری نبوت اور آخری دستور العمل (قرآن) دے کر خود کفیل اور خود مختار بنا دیا۔ آگاہی اشیاء کے بارے میں معلومات سے ملتی ہے جسے علم کہتے ہیں اور علم دینے کے طریقے اور انتظام کو تعلیم ونظام کہتے ہیں۔

جدید مسلم معاشروں وریاستوں کی تاریخ یہ ہے کہ انہوں نے سارا نظام تعلیم علم دشمنی پر استوار کیا ہے۔ علم کو کافر اور مسلمان میں تقسیم کر کے دشمنی کو ہوا دی حالانکہ علم

سارے کا سارے لوح محفوظ سے آتا ہے اور انسانوں کے لیے آتا ہے۔ غلط وصحیح کو انسان ہی پہنچاننے کا ذمہ دار ہے۔ اور انسان جہاں ہے وہاں غلط وصحیح کی کشمکش اور پہچان کے لیے جدوجہد سے آگے بڑھے گا۔ غلط بھی انسان ہی کرے گا اور درست بھی انسان ہی کرے گا۔

علم کی درجہ بندی عقلیت، حسیت اور وحی کی ہے۔ یہی تقسیم یا درجہ بندی ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے بھی اختیار کی ہے۔ عقلیت میں انسانی ذہن و بصیرت کو اولیں درجہ حاصل ہے گویا اشیاء کے بارے میں معلومات /علم کی تصدیق وہ اپنے عقلی زور پر حاصل کرتا ہے۔ انسان اس میں فیصلہ کن ہے لیکن وہ عقل کو معروضی حالات کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ انسانی عقل وبصیرت کی نشوونما کی ایک ارتقائی تاریخ ہے۔ اس کی تاریخ میں سنہری مثال یونان کے فلاسفہ کی ہے۔ مسلم تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یونانی حکماء کی حکیمانہ کتب کو مسلمانوں نے اختیار کیا اور وہ محض قرآن کے استدلالی پہلو کو بھی اجاگر کرنے کے لیے تھا اور یہ آیت کے حکم کے مطابق تھا۔

''افلایتدبرون القرآن''

اسی طرح تفکروں (بقرہ ۲۱۹)، یتفکروں تقریباً گیارہ مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔ اس میں انسان کو دعوت فکر دی گئی ہے اور علامہ محمد اقبال نے آپ ﷺ کی خصوصی دعا کا حوالہ دیا ہے کہ باری تعالیٰ مجھے اشیاء کی اصل حقیقت سے آگاہ کر (۴۹) مسلمانوں نے یونانی علوم کو کم ازکم اُس وقت کافر نہیں جانا۔ تمام یونانی علوم کی میسر کتب عربی میں ترجمہ کی گئیں اور آج یورپ نے اپنے علوم کی بنیادیں جس یونانی علم پر رکھی ہیں، اُن کے نسخہ جات مسلمانوں کے عربی میں ترجمہ شدہ اور تصحیح شدہ ہیں۔ بہت سے یونانی علوم ہمارے دینی مدارس میں پڑھائے گے اور بعض جگہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے لیکن مغرب نے اُس سے استفادہ کیا اور علم کو آگے بڑھایا۔ اُسی کو ہمارے ہاں علم جدید کہتے ہیں اور اُس کو ہمارے

ہاں کفر کہتے ہیں۔علامہ اقبال نے پانچویں خطبہ میں اسلام کو عقل استقرائی کا نتیجہ قرار دیا ہے یہ اہل فکر کے لیے ایک سنجیدہ سوال ہے۔

حسیت علم جدید کا تجربی پہلو ہے۔ حسیت نے عقلیت پر سارا مدار نہیں کیا او رکہا محض عقلیت سے حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ مشاہدہ وتجربہ حقیقت تک رسائی کا بہترین ذریعہ ہیں عقلیت اورحسیت کی کشمکش کے دوران مذہبی پہلو کی حیثیت ختم ہوگئی اور یوں عقلیت وحسیت کی جنگ کے نتیجے میں علم جدید معرض وجود میں آیا۔

مغرب میں مذہب کی کمزور استدلالی پوزیشن نے علم کے حوالے سے مذہبی حیثیت کو متنازعہ بنادیا۔ اگر ایک خاص موڑ پر انسان کا ذہن محض عقلی وحسی علم کو یقینی علم سمجھتا ہے تو اس کا مطلب نہ تو یہ ہے کہ مذہبی یا وحی علم کا یقینی پہلو نہیں ہے اور نہ اس سے یہ اصول اختیار کیا جاسکتا ہے کہ مذہبی وحی کو علم کا یقینی پہلو تسلیم نہ کرنے پر سارا علم جدید کفر ہوگیا ہے۔

انسانی تاریخ کی موجودہ چند صدیوں سے قبل مذہبی وحی کا علم ہی یقینی تھا اور کوئی پہلو موجود نہ تھا۔ دراصل مذہبی وحی کا منشاء ومدعا ہی یہ تھا کہ انسان شعور وآگاہی میں باعتماد انداز میں آگے بڑے اور موجودہ عقلی وحسی علم جدید دراصل؛ مذہبی اوحی کے نصب العین کا حصول ہے۔ اس لیے علم جدید کافر ہے اور نہ مذہبی علم دقیانوسی ۔معلومات کے مآخذ ہیں۔ انسان کی راہیں ہیں۔علم کی راہیں ہیں۔ جوان راہوں پر آگے بڑھیں گے وہی بڑے مومن انسان ہوں گے۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے تقسیم سے پہلے انگریزی دور اور بعد از تقسیم پاکستان میں مروج نظام تعلیم کو لادینی قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''نظام تعلیم لادینی ہوگیا ۔نصاب میں مذہب کا کوئی شائبہ باقی نہ رہا۔ مذہب انفرادی، نجی، شخصی، باطنی پہلو سے وابستہ ہوکر رہ گیا۔ اب چونکہ زندگی پر عقائد کا کوئی اثر نہ رہا اس لیے عقائد اوہام باطلہ بن گے اور عبادات رسوم وظہور ہوکر رہ

گئیں۔''(۵۰)

یہ تصور کر لینا کہاں تک درست ہے کہ انگریزوں سے قبل ہمارا نظام تعلیم اسلامی یا دینی تھا؟ مغل سلطنت مسلمانوں کی نمائیدہ تھی۔ اقتدار ان معنوں میں مسلمانوں کے پاس تھا۔ تعلیم کا ڈھیلا ڈھالا نظام شخصی بھی تھا اور سرکاری سرپرستی بھی کہیں کہیں اسے حاصل تھی۔ مسلمانوں نے ایک ہزار سال ہندوستان پر حکومت کی اور جو گروہ برسر اقتدار رہے۔ اپنی زبان اور اپنا نظام لاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات درست ہے کہ:

''ہم زوال پذیر مطلق العنانی کا بدل سیاست میں اور زوال پذیر جاگیرداری نظام کا بدل معیشت میں تلاش نہ کر سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دیر تک اپنی سیاسی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکے اور معاشی انقلاب کی قیادت ہمارے ہاتھ سے چھن گئی۔''(۵۱)

یہ حقیقت ہے کہ اقتدار جیسا بھی ہو، جب چھن جاتا ہے تو اُس جگہ نیا اقتدار آتا ہے تو نظام زندگی بدلتا ہے۔ موثرات زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔ اقدار بدل جاتی ہین۔ یہ حقیقت ہے ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوا ہے اور ایسی صورت میں آئیدہ بھی یہی ہوا کرے گا۔ یہ جو گرتا ہے یہ اُس کا کام ہے کہ وہ دوبارہ کیسے اٹھتا ہے خالصتاً اپنی فکر پر اُٹھ سکتا ہے؟ کیا ایسے معروضی حالات اُس کے لیے موجود ہیں؟ اگر ایسا نہ ہو اور اکثر ایسے نہیں ہوتا۔ محکومی میں اقدار، نظام تعلیم اور نظام زندگی بدلے بغیر رہ ہی نہیں سکتا مگر مٹنا تو پھر بھی نہیں ہوتا۔ مٹنا کسے اچھا لگتا ہے۔ اُٹھنا تو ہوتا ہے۔ اس اٹھنے کے لے اپنی روایت کی بنیاد پر نئی حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے۔

دینی ولادینی کی فکر علم کے حوالے سے پاکستان کی تشکیل کے بعد مزید تیز ہوئی۔ اس تیزی میں مذہبی جماعتوں کا زیادہ زور تھا۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے بھی دینی ولادینی، اسلامی معاشرہ وغیر اسلامی معاشرہ کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ عام قاری الفاظ کے سیدھے مفہوم ہی تک پہنچ پاتا ہے حالانکہ ڈاکٹر صاحب کا زیادہ زور اس امتیاز کو قائم

رکھتے پر ہے جو وحی اور علم جدید کے درمیان ہے لیکن اُن کی یہ سعی بھی اُس غلط فہمی کے اضافہ کا سبب بنی کہ موجود علوم اسلامی نہیں اور جو اسلامی علوم ہیں وہ موجود نہیں ہیں اور زندگی لادینی نمونے پر گذر رہی ہے۔ یہی انداز فکر قریب قریب مسلم دنیا اور خصوصاً پاکستان میں اختیار کیا گیا۔ مجھے اس انداز فکر کے درست یا نادرست ہونے سے بحث نہیں بلکہ وہ حالات جو پیدا ہوئے۔ جنہوں نے علم دوستی کے رجحان کے برعکس علم دشمنی کے رجحان کو تقویت دی، وہ قابل تحسین نہیں ہیں۔ نتائج درست نہیں آئے اس کے باوجود کہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اس کی وضاحت کرتے ہیں:۔

''تعلیم قوموں اور تہذیبوں کو دوام واستقلال عطا کرنے کا علم ہے۔''(۵۲)

دوسری جگہ وضاحت کرتے ہیں کہ مذہب کو اصرار ہے کہ:۔

''انسان کی علمی استعداد کے ناقص ہونے کے باوجود اس کی علم حقیقت کی آرزو کیسے پوری ہو۔''(۵۳)

تعلیم تعمیر قوم وتشکیل تہذیب کا نام ہے۔اسی کو علم کہا جاتا ہے اور اسی کو انسان حاصل کرنے کی آرزو رکھتا ہے اُس کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔عقلیت وحسیت سے گزرتا ہے۔ وحی سے فیض پاتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔

علم وتعلیم کے بحث میں دو شخصیات کا تذکرہ نہ کرنے سے بات مکمل نہیں ہوتی وہ ہیں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۔ ان دونوں حضرات کے نزدیک علم چاہے کسی اور جہاں سے اُس کا ظہور ہوا ہو، وہ کافر نہیں ہے۔علم سے کم وبیش استفادہ کرنا ایک الگ بات ہے مگر اُسے اپنے تعلیمی نظام اور علمی شعور سے الگ کرنا ناانصافی ہے اور جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ علامہ اقبال کے پہلے دونوں خطبات علم پر ہیں جس میں وہ عقلیت وحسیت کو حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ اُس کی تازہ حکمرانی کو چیلنج نہیں کرتے۔ تطبیق کے اصول وقواعد مرتب کرتے ہیں اور علم اور مذہبی مشاہدات کی یکساں حیثیت اور مذہبی مشاہدات کے علمی معیار کے لیے زبردست استدلالی موقف اپناتے ہیں۔ دوسری طرف

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے ''قرآن اور علم جدید'' میں یہ موقف اپنایا ہے۔(راقم کی کتاب ''مطالعہ قرآن کی نئی جہتیں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ملاحظہ کریں)

علامہ محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے علم جدید کو بھی علم ہی کا حصہ قرار دیا ہے اور یہ قرار دیا کہ علم کا فرنہیں کسی بھی قسم کا علم حاصل کرنا انسان کو آگے بڑھانے کے مترادف ہے۔ علامہ نے پہلے خطبے میں وضاحت کی ہے:۔

''فلسفہ (عقل) کی روح ہے آزادانہ تحقیق۔ وہ ہر اُس بات کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا ہے جس کی بنا ادعا اور تحکم پر ہو۔ اس کا منصب یہ ہے کہ فکر انسانی نے جو مفروضات بلا جرح وتنقید قبول کر رکھے ہیں، ان کے مخفی گوشوں کا سراغ لگائے۔''(۵۴)

آگے چل کر فرماتے ہیں:

''ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذہب کی حیثیت محض احساس کی نہیں، اس میں تعقل کا ایک عنصر بھی شامل رہتا ہے۔''(۵۵)

اور مزید لکھا:

''عقلی اساسات کی جستجو کا آغاز آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک سے ہی ہوگیا تھا آپ ﷺ ہمیشہ دعا فرماتے ''اے اللہ مجھ کو اشیاء کی اصل حقیقت سے آگاہ فرما۔''(۵۶)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین لکھتے ہیں:۔

''سارا علم خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہم تک پہنچے، حقیقت کائنات (جس میں انسان بھی شامل ہے) کا علم ہے۔(۵۷)

اور مزید رقمطراز ہیں:

''انسانوں کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ لوح محفوظ سے تقسیم کیا جاتا ہے جب لوح محفوظ کی جھلک کسی سائنس دان پر پڑتی ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے نیا انکشاف کیا ہے۔ جب کسی درویش اور عابد پر (یہ جھلک) پڑتی ہے تو وہ

کہتا ہے کہ اُسے خدا کی معرفت حاصل ہوئی ہے۔ جب کسی نبی پر پڑتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ خدا نے اُس پر وحی نازل کی ہے اور وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے مامور ہوا ہے۔ قرآن مجید اسی لوح محفوظ کا مجمل نقشہ ہے اور تمام کائنات کا علم مجمل طور پر اس کے اندر موجود ہے۔''(۵۸)

معیار تعلیم ومقدار تعلیم کی نظریاتی، عملی، اطلاقی اور افادی حقیقت ہی کسی ملک ومعاشرہ کے لیے مفید صورت پیدا کرتی ہے اور یہی معیارات ہیں۔ ہمارے سامنے یقیناً پاکستان کی مثال ہے۔ نظریاتی بحث پچھلی سطور میں بھی کی گئی ہے اور یوں بھی ہماری بحثوں کا اکثر زور نظریاتی رہتا ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ابھی تک نظریاتی بحث کی ڈور بھی سلجھی نہیں بلکہ مزید الجھتی جارہی ہے مگر تعلیم کے عملی، اطلاقی اور افادی پہلو کو نظر انداز کیا گیا اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ درج ذیل لٹریسی ریٹ کا حوالہ دیا جارہا ہے۔

سال	لٹریسی ریٹ
۱۹۵۱ء	۱۷.۹ فی صد
۱۹۶۱ء	۱۶.۷ فی صد
۱۹۷۲ء	۲۱.۷ فی صد
۱۹۸۱ء	۲۶.۲ فی صد
۱۹۹۳ء	۳۵.۴ فی صد

معیار یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے والوں کی کل تعداد کتنی ہے؟ اور آبادی میں اس کا تناسب کیا ہے۔ لکھنا پڑھنا اور مزید علم حاصل کرنا مقصد ٹھہرا تو ایسے میں دینی ولادینی کی کوئی بحث نہیں آتی۔ کوئی مدرسوں سے پڑھا یا جدید تعلیمی اداروں سے، معیار تو ایک ہی ہے کہ وہ پڑھے لکھے ہوں۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے وسیع قیام نے تعلیم کے اطلاقی وافادی پہلو کو بھی روشناس کرایا ہے۔ جس میں نصاب کو مالی ومعاشی مفادات کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ افراد کی تربیت معاشی دنیا میں کام کے اعتبار سے کی جانے لگی ہے۔ تکنیکی میدان میں

تعلیم کو عام کیا جارہا ہے۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے سے بچانے کا عندیہ دیا جارہا ہے۔ عالمگیریت کو جاننے اور سمجھنے کی تعلیم کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ دنیا میں کام کے معیار پر توجہ مبذول کی جارہی ہے۔ گویا علم وہنر پر توجہ پہلے کی نسبت بہتر ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود دینی ولادینی کی ہماری بحث اختتام پذیر نہیں ہوئی ہے۔ خدا انسان کے اندر موجود ہے اُسے دریافت کرنا انسان کا مسئلہ ہے۔ یہ کائنات انسان کے لیے ہے اور انسان کائنات کے لیے ہے۔ خدا کو انسان علم کے ذریعے حاصل کرے گا۔ علم کافر نہیں ہے۔ یہ لوح محفوظ سے نازل ہوتا ہے۔ علم کا منبع لوح محفوظ ہے اور علم کا آلہ انسان ہے۔ انسان سارا زور اپنے آپ کی دریافت کے لیے لگا رہا ہے اور جس دن اُس نے اپنے آپ کو پالیا وہ راز ہستی بھی جان جائے گا۔ البتہ علم کی دو ارتقائی منازل ہیں۔ ایک وحی کا علم ہے یہ خطا سے پاک ہے اس سے استفادہ اپنے اپنے وقت کا اور اپنے سماجی پس منظر میں انسان ہی اٹھاتا ہے۔ دوسرا علم، علم انسانی ہے۔ علم یہ بھی لوح محفوظ سے آتا ہے مگر عام انسان پر آتا ہے اور وحی نبوت کے بغیر وحی نہیں کہلا سکتی۔ البتہ وحی اور انسانی کاوشوں سے اقدام وخطا کے انداز میں حاصل ہونے والے علم میں امتیاز رکھنا علم کے ارتقاء اور آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہے۔

صحت مند افراد سے صحت مند معاشرہ پیدا ہوتا ہے۔ جب کہ بیمار افراد سے بیمار معاشرہ پیدا ہوتا ہے۔ مسلم دنیا میں تعلیم وانصاف پر توجہ ہے نہ صحت پر۔ جو صحت مند ہے، ٹھیک ہے جو صحت مند نہیں ہے۔ وہ اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ کمزور معاشرہ کی نشانی ہے۔ دوسری طرف غیر مسلم دنیا یا مغرب وایسٹ ایشیاء یا بقول روایتی اصطلاح کافروں کے معاشروں میں صورت حال یہ نہیں ہے۔ وہاں بیمار کی ذمہ داری ریاست پر ہے۔ ریاستیں یہ ذمہ داری پوری کرتی ہیں۔ ہماری مسلم دنیا میں صحت پر توجہ ریاستی ذمہ داری نہیں سمجھی جاتی ہے۔

آپ ﷺ نے بیمار کی عیادت تک کی تلقین کی ہے۔ لوگوں کی صحت کے حوالے سے جب ہماری ریاستیں اور معاشرے سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں تو گویا یہ لوگ غیر اسلامی و غیر انسانی حرکت کرتے ہیں۔ یہاں دینی ولادینی کی اصطلاح بھی استعمال نہیں

ہوتی۔ مسلمان مشنری عیسائی ہسپتالوں میں علاج کرانا صحیح سمجھتے ہیں بلکہ ترجیح دیتے ہیں کہ درست علاج کریں گے۔

مغرب میں برطانیہ کی مثال موزوں رہے گی جس سے ہماری اکثریت قدرے اگاہ ہے۔ وہاں صحت کا باقاعدہ سرکاری وغیر سرکاری نظام ہے۔ سرکاری ہسپتالوں میں برطانیہ کے شہری کا مفت علاج ومعالجہ ہوتا ہے۔ پرائیوٹ ہسپتالوں میں فیس لی جاتی ہے۔ برطانیہ کے تمام شہریوں کو سال میں ایک دفعہ مکمل سالانہ چیک اپ کرانا ہوگا۔ ہرایک کا کمپیوٹر ڈیٹا موجود ہے۔ جنرل پریکٹیشنر (G.P) کے پاس ہر شخص کو سارے ملک میں رجسٹرڈ ہونا پڑے گا۔ یہ لوگ اپنی رہائش کے قریب انتخاب کرتے ہیں۔ معمولی بیماریوں کی تشخیص اور دوائی کی چوبیس گھنٹے سروس دستیاب ہے۔ ایمرجنسی کال پر چند منٹ میں ہسپتال سے ایمبولنس دستیاب ہوتی ہے۔ یہ ہیلتھ سروس کا ایک مختصر بیان ہے۔ مسلم دنیا میں شائد ہی کسی ملک میں یہ انتظام ہو۔ کم از کم پاکستان میں یہ صورت حال خوفناک حد تک غیر منظم ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ وقت کے منظر کا گہری مگر مثبت سوچ سے مطالعہ کیا جائے۔ وقت کی موجودہ دوپہر میں ہم کہاں کھڑے ہیں اور باقی کی دنیا کی حرکت کیا ہے؟ ہمارا قومی نصب العین کیا ہے؟ اور ہمیں اُسے کیسے حاصل کرنا ہے؟ حصولِ نصب العین کے لیے جو حکمت عملی ہم قومی سطح پر بنائیں گے دراصل وہ دینی ہوگی وہ علمی ہوگی۔ ہمیں اپنے آپ پر اعتماد کرنا ہوگا۔ (وما علینا الا البلاغ)

☆☆☆

حواشی

۱۔ منطق کے حوالے سے یہ ابتدائیہ ابن رشد کی کتاب ''فصل المقال'' ترجمہ عبیداللہ قدسی، اقبال اکادمی کراچی مزید اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۷ء ص: ۱۷، ۱۸ کے علاوہ نصابی کتب بھی مثلاً کرامت حسین جعفری کی منطق استقرائیہ اور منطق استخراجیہ عمومی طور پر سمجھنے میں مفید ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر میں یہ الفاظ و اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ قاری کی سہولت کے لئے چند اصطلاحوں کا اندراج کیا گیا ہے۔

۲۔ منہاج القرآن، ص ۷۶

۳۔ اسلام وفلسفہ، ص ۳۸

۴۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ص ۲۶۲

۵۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل

۶۔ منہاج القرآن، ص ۹۲

۷۔ اسلام وفلسفہ، ص ۳۹

۸۔ منہاج القرآن، ص ۹۴

۹۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ص ۲۶۲

۱۰۔ منہاج القرآن، ص ۹۵

۱۱۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ص ۲۶۳

۱۲۔ منہاج القرآن، ص ۹۴

۱۳۔ انسان جو علم مختلف ذرائع سے اپنی ذہنی وعلمی کوشش سے حاصل کرتا ہے۔ اسے انسانی ذہن کا زائیدہ علم یا انسانی استعداد سے حاصل شدہ علم کہتے ہیں۔

۱۴۔ اقدام وخطا کہ انسان قدم اٹھاتا ہے، تجربہ کرتا ہے، غلطی کرتا ہے، پھر غلطی کو درست کرتا ہے یہی انسانی استعداد کا علم بھی ہے۔ احتمال خطا کہ جہاں غلطی کے امکانات موجود ہیں۔

۱۵۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ص ۲۸

۱۶۔ اسلام اور فلسفہ، ص ۱۶

۱۷۔ اسلام اور فلسفہ، ص ۴۴

۱۸۔ اسلام اور فلسفہ، ص ۴۵

۱۹۔ کلاس نوٹ ذاتی

۲۰۔ اسلام اور فلسفہ، ص ۱۱۵

۲۱۔ منہاج القرآن ۱۸۳۔ اسلام اور فلسفہ، ص ۱۰۶ اور کلاس نوٹ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

۲۲۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ص ۳۱۴

۲۳۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ص ۳۱۲

۲۴۔ کلاس نوٹ غیر مطبوعہ

۲۵۔ تبدیلی وحرکت کا مطلب ان سطور میں پوری کائنات کے حوالے سے علم طبعیات میں اصطلاحاً مستعمل حرکت نہیں ہے۔

۲۶۔ سی ایم جوڈ۔ علم کے نئے افق۔ ترجمہ سید قاسم محمود، ص ۴۴

۲۷۔ رابرٹ بریفالٹ ''تشکیل انسانیت'' (ترجمہ)، ص ۵۳۵

۲۸۔ کلاس نوٹ غیر مطبوعہ

۲۹۔ اسلام اور فلسفہ، ص ۲۴۹

۳۰۔ کلاس لیکچر مطبوعہ فکر مستقبل شمارہ ۲

۳۱۔ منہاج القرآن، ص ۲۱۱

۳۲۔ منہاج القرآن، ص ۳۰۱

۳۳۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ص ۶۶

۳۴۔ منہاج القرآن، ص ۲۱۰

۳۵۔ کوتلیہ چانکیہ ارتھ شاستر، ترجمہ سلیم اختر ۲۰۰۶ء، نگارشات، لاہور

۳۶۔ نکولو مکیاولی (۱۵۶۱ء۔۱۴۵۰ء) اطالیہ کا باشندہ تھا۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین، بادشاہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۳۷۔ ڈاکٹر محمود حسین ''مقدمہ بادشاہ، ص ۳۰

۳۸۔ تشکیل جدید الہیات الاسلامیہ۔ خطبہ نمبر ۶

۳۹۔ اسلام اور فلسفہ، ص ۱۹۷

۴۰۔ علامہ محمد اقبال ''خطبات''، ص ۲۴۵

۴۱۔ علامہ نے ''روحانی جمہوریت'' کا لفظ چھٹے خطبے کے آخر میں استعمال کر کے الگ فکر کی بنیاد رکھی۔

۴۲۔ چودھری مظفر حسین ''روحانی جمہوریت'' آل پاکستان ایجوکیشن کانگرس، ۷ فرنیڈز کالونی، لاہور، ص ۲۰۶، ۲۰۰۲۔ چودھری مظفر حسین نے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے ساتھ آل پاکستان ایجوکیشن کانگرس میں کام کیا ہے۔ اُسی نسبت سے یہ حوالہ دیا ہے۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۵

۴۴۔ روز نامہ جنگ، ۱۶۔اپریل ۲۰۱۰ء۔

۴۵۔ قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ص ۱۲۶

۴۶۔ روزنامہ جنگ ۲۰۱۰ کیسا ہوگا

۴۷۔ ایضاً، ص ۶۵

۴۸۔ اسلامی بینک کاری کے پس منظر، حقیقت طریقہ کار اور موجودہ صورت حال پر محمد نجات اللہ صدیقی کی کتاب ''مقاصد شریعت'' باب چھ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ یہ کتاب ادارہ تحقیقات اسلامی نے شائع کی ہے۔

۴۹۔ خطبات (اول)، ص ۴

۵۰۔ اسلامک ایجوکیشن اپریل، مئی، جون، ۱۹۷۱ء جلد ۳ شمارہ ۲ آل پاکستان ایجوکیشن کانگرس لاہور، ص ۱۹

۵۱۔ ایضاً، ص ۲۰

۵۲۔ اسلامک ایجوکیشن اپریل مئی، جون ۱۹۷۱ء، ص ۳۷

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۸

۵۴۔ خطبات (اول)، ص ۱

۵۵۔ ایضاً، ص ۲

۵۶۔ ایضاً، ص ۴

۵۷۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین، قرآن اور علم جدید، ص ۸۲

۵۸۔ قرآن اور علم جدید، ص ۸۸